نومبر 2008

قیمت : -/10 روپے

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Annual Subscription

	Surface Mail	Air Mail
Pakistan	Rs. 192	480
Nepal	Rs. 300	588
BanglaDesh	Rs. 132	420
Rest of World	Rs. 300	684

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

فروغ انسانی وسائل کی وزارت، حکومت ہند

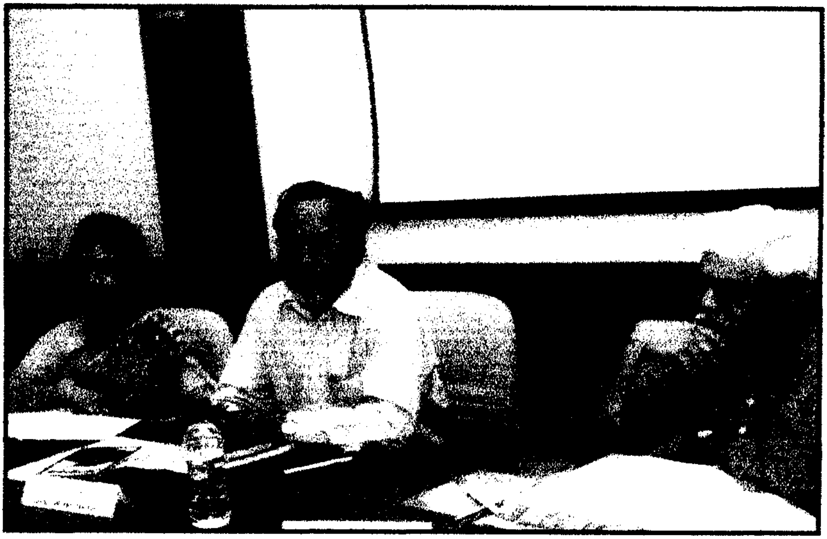

قومی اردو کونسل کے ایگزیکٹیو بورڈ کی میٹنگ 22 ستمبر کو انڈیا اسلامک کلچر سنٹر میں کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال کی صدارت میں منعقد ہوئی۔
تصویر میں (دائیں سے) کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید، جناب چندر بھان خیال اور محترمہ انیتا بھٹناگر جین، جوائنٹ سکریٹری وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند۔

میٹنگ کے ایجنڈے پر غور کرتے ہوئے (بائیں سے) محترمہ ریتا چٹرجی، ڈائرکٹر لنگوبجو، جناب پی۔اے۔ انعامدار، کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد
اور اسسٹنٹ فائنینشیل ایڈوائزر جناب ٹی۔وی۔راؤ۔ پچھلی صف میں کونسل کے عملے کے اراکین محترمہ نیلم رانی، جناب ڈی۔آر۔راجہ، جناب کمل سنگھ اور محترمہ شمع کوثر یزدانی۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔10، شمارہ۔11، نومبر 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938 ,26103381
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26169416 ,26109746

شاخ: 110-7-22 فرسٹ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1 متھر گنج، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 6

زبان، ادب اور تعلیم

● تعلیمی میدان میں صنفی امتیازات .... محمد یٰسین 7
● اردو اور فاصلاتی نظام تعلیم .... وسیم بیگم 9
● افسانہ اور انشائیہ کے حدود .... بیگ احساس 11
● آگ کا دریا میں ویدوں کے حوالے .... ذاکر فیضی 14
● طلاق (افسانہ) .... مہاشویتا دیوی/قیصر شمیم 16

گوشۂ رالف رسل

● رالف رسل .... محمود ہاشمی 19
● رالف رسل اور اردو .... فیروز مکرجی 22
● باتیں رالف رسل کی .... ارجمند آرا 24
● رالف رسل سے انٹرویو .... فیضان عارف 29
● اردو سیکھنا .... رالف رسل 32
● رالف رسل کی خودنوشت .... ابوبکر عباد 35

شخصیات

● ڈاکٹر سید محمود .... ریحان غنی 40
● حبیب تنویر—ایک زندہ داستان .... حبیب احمد 42

کیریئر

● چائے صنعت میں روزگار .... کاشف غزالی 47

روبرو

● پروفیسر صادق سے گفتگو .... غضنفر اقبال 49

ہماری مطبوعات سے

● انٹرویو .... انجم مانپوری 53

اردو خبرنامہ .... ادارہ 60

تبصرہ و تعارف

● دیوان درد .... عبدالحق 74
● مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ .... نوشاد عالم ....
● آج کل اور پریم چند .... پردیپ جین ....
● مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا .... مخمور سعیدی ....
● جرمنی میں دس روز .... ابوظہیر ربانی ....
● جدید غزل .... شعیب رضا فاطمی ....

بچوں کا گوشہ

● ایک بہادر بچہ .... رضوان رضوی 80

آپ کی بات

■ **خالد عبادی، پٹنہ**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے۔ اس شمارے کی سب سے خاص چیز ''گوشۂ احمد فراز'' ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گوشہ کافی اہم اور بھرپور ہے۔ اگرچہ معاصر رسائل میں شائع ہونے والے دیگر گوشوں کی طرح اس میں بھی فراز کی شاعرانہ اہمیت اور فنکارانہ قدر وقیمت کو بہت حد تک نظر انداز کیا گیا ہے، اس لحاظ سے لطف الرحمٰن کا مضمون ممتاز قرار پائے گا کہ اس میں فراز کی شعری فتوحات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ ہم احمد فراز کے فکری وفنی سروکار کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے۔ وہ باتیں جن کا ذکر نہ ہو بھی تو شاعر کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، ان کا ذکر خوب خوب اور دھوم دھام کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن وہ باتیں اور وہ معاملات جو فنی اور فکری نقطۂ نظر سے کافی اہم اور سب سے زیادہ لائق توجہ ہیں ان پر سرے سے کسی کی توجہ ہی نہیں جاتی۔ شکیب جلالی پر لکھنے والے یا احمد مشتاق کے سر پر عظمت کا تاج رکھنے والے نقادوں کو آخر کون سی چیز اس قدر متحرک رکھتی ہے کہ انھیں احمد فراز جیسے شاعروں کے بارے میں سوچنے اور سنجیدگی سے کسی نتیجے تک پہنچنے کی فرصت نہیں دیتی۔ حالانکہ احمد فراز، شکیب جلالی اور احمد مشتاق سے زیادہ اہم، ممتاز اور لائق توجہ شاعر ہے۔ نقادوں کے بارے میں ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انھیں گاڈ فادر بننے کا بے شری کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ احمد فراز نے ان کے اس شوق کا خون کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں کیا۔ وہ جہاں تک پہنچنا چاہتے تھے ان نقادوں المعروف بہ گاڈ فادروں کے بغیر ہی پہنچ گئے۔ اب ان کے پاس سوائے اس کے کیا بچا تھا کہ وہ احمد فراز پر لکھنے سے دست کش ہوجائیں یا شرارت انگیز اور سطحی باتوں کو عام کرتے رہیں۔ اب رہے وہ لوگ جو احمد فراز کے شعر سنتے، گنگناتے اور ان میں اپنے خواب وخیال اور آرزو کو لرزاں دیکھتے تھے، اس قابل نہ تھے کہ احمد فراز کی ''سنجیدہ اور مدلل مداحی'' کا فریضہ انجام دیتے۔ دراصل وہ اپنی پسند کی منطقی توجیہہ کرنے والے لوگ نہ تھے۔ یا اس میں ان کی دلچسپی نہ تھی یا شاید وہ اس کے اہل ہی نہ تھے۔ اس کے ساتھ ایک بہت ہی اہم بات یہ بھی ہے کہ ہمارا موجودہ ادبی معاشرہ اپنے کلاسیکی شعری سرمائے سے یا تو ناواقف ہے یا اس کے بارے میں کماحقہ نہیں جانتا۔ نقادوں میں بھی اب ایسے افراد خال خال ہی بچے ہیں (کسی کے نام، شہرت اور دنیاوی وجاہت پر نہ جائیں، اس کی تحریر کے باطن میں جھانک کر دیکھیں) میرا خیال ہے کہ احمد فراز نے اپنی شاعری سے وہ کر دکھایا ہے جو (بطور خاص حالی مرحوم کے بعد) کسی دوسرے شاعر سے اس سطح پر نہیں ہوسکا۔ عشق خواہ زندگی سے ہو، زندگی کرنے والوں سے ہو یا امکان زندگی سے لبریز کائنات سے۔ اس کے لیے جرأت بھی چاہیے اور سلیقہ بھی۔ فراز کے اندر یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ (ہوسکتا ہے ظفر اقبال یا افتخار جالب میں بھی ایسی کوئی چیز موجود ہو جس کا استعمال انھوں نے جدیدیت کو مالا مال کرنے میں کیا ہو لیکن یہ ان پر ہی ختم نہیں ہوجاتی۔ ذرا انداز نظر بدل کر دیکھیں تو یہ سلسلہ مختلف صورتوں میں کل بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔) ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ موضوعات جو خالص شاعرانہ ہوتے ہوئے بھی ٹاٹ باہر کردیے گئے تھے احمد فراز نے انھیں پوری قوت اور دل جمعی کے ساتھ عہد نو کے شعری مزاج کا حصہ بنانے میں ''لازوال کامیابی'' حاصل کی ہے۔ میں اسے لازوال کامیابی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنی شعری روایت کے امین اور مزاج داں فنکار آج تو کیا آئندہ بھی نہ صرف اسے توصیفی نظروں سے دیکھیں گے بلکہ اس سلسلے کو اپنے طور پر آگے بڑھانے کے لیے خود کو مجبور پائیں گے۔ لفظوں کے استعمال میں بھی انھوں نے ''بے خودی وہشیاری'' کے بہترین امتزاج کا ہی مظاہرہ کیا ہے۔ احمد فراز نے متکلم (عاشق/باغی وغیرہ) لے کر مخاطب تک کے ہر مرحلے اور ہر روداد کو اپنی شاعری میں زندہ و پائندہ کردیا ہے۔ اس نے شاعر سے باغی، باغی سے متقی اور مغنی سے شاعر بننے کے لیے بڑا ریاض کیا ہے۔ احمد فراز کے یہاں اچھے، عمدہ اور پسندیدہ اشعار کی کثرت بھی اس کے فکری وفنی انداز اور شعری خصائص کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ خیر میلہ تو میلہ ہی ہوتا ہے نہ؟ آپ کیا کیا شمار کرتے پھروگے۔

■ **پرجپال سنگھ بیتاب، کمشنر سکریٹری، اے آر آئی اینڈ ٹریننگ ڈپارٹمنٹ، حکومت جموں وکشمیر، بھٹوں (جے اینڈ کے)**

''اردو دنیا'' کے ستمبر 2008 کے شمارے میں فاروقی صاحب کا مضمون ''کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں'' پڑھا۔ میں فاروقی صاحب کی اس بات سے صد فیصد متفق ہوں کہ اردو کے لیے موجودہ (نستعلیق) رسم الخط دیوناگری رومن وغیرہ تمام رسوم الخط کے مقابلے میں موزوں ترین اور مناسب ترین ہے۔ آج کی تاریخ تک تو اردو کا تشخص ہی اس رسم الخط سے جڑا ہوا ہے اور رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مطلب ہے اس زبان کے بنیادی تشخص اور اس کی انفرادیت کو ختم کرنا۔ اس سلسلے میں میں فاروقی صاحب کی تمام دلیلوں سے اتفاق کرتا ہوں۔

فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے ''انگریزوں نے پہلے تو اس (ہماری زبان) کا نام ہندی سے بدل کر ہندوستانی رکھنا چاہا۔ جب وہ نہ چلا تو

ان کی خوش قسمتی سے لفظ ''اردو'' ان کے ہاتھ آ گیا''

اور پھر یہ کہ:

''اگر ہماری زبان کا اصل نام یعنی ہندی برقرار رکھا جاتا تو یہ افسانہ گھڑنا اور رائج کرنا ممکن نہ تھا کہ یہ لشکری زبان ہے۔ بھلا کون تھا جو تسلیم کرتا کہ جس زبان کا نام ہندی ہوا سے لشکریوں اور فوجیوں نے رائج کیا تھا۔''

یہاں سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر انگریزوں نے ہماری زبان کا نام نہ بدلا ہوتا یا وہ اس سلسلے میں کامیاب نہ ہوئے ہوتے اور ہماری زبان کا نام ''ہندی'' ہی برقرار رہا ہوتا تو کیا پچھلے دو سو سال میں ہندوستان کے تمام ہندوؤں نے ہندی نام کی زبان کو اردو کے موجودہ رسم الخط کے ساتھ اپنا لیا ہوتا؟ میرے خیال میں ایسا ہرگز ممکن نہیں تھا اور یقیناً بہت سارے (یعنی کروڑوں) ہندوؤں نے ہندی کو (یعنی ہماری زبان کو) دیوناگری میں لکھنا جاری کر دیا ہوتا۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایسے میں ایک ہی زبان (یعنی بھاشا) کی دو تحریریں (یعنی دو لکھاوٹیں) معرض وجود میں آ چکی ہوتیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس حد تک فاروقی صاحب کے اور مرحوم گیان چند جین کے نظریات ملتے جلتے ہیں۔

پھر ایک اور دلچسپ اور قابل غور بات یہ ہے کہ اگر ہماری زبان (یعنی اردو) کا نام ہندی ہی برقرار رہا ہوتا تو کیا 1947 کے بعد پاکستان نام کے ملک کی سرکاری زبان ہندی ہی ہوتی یا کوئی اور زبان۔ کیا پاکستان نام کا اسلامی ملک ہندی زبان کو اپنی سرکاری زبان بنا پاتا؟ میرے خیال میں تو ایسا کبھی ممکن نہ ہوتا۔

''ہند''، ''ہندی''، ''ہندو'' اور ''ہندوستان'' وہ الفاظ ہیں جن کا ہندو دیومالا یعنی پورانوں میں کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ الفاظ وہ نام ہیں جو دسویں صدی عیسوی کے آس پاس بھارت میں آنے والے عربی فارسی اور ترکی بولنے والے حملہ آوروں اور دوسرے لوگوں نے یہاں کی سرزمین یہاں کی زبانوں اور یہاں کے لوگوں کو دیے۔

یہ بات تواریخی حقائق پر مبنی ہے کہ اس عہد کے باہر سے آنے والے یعنی عربی فارسی اور ترکی وغیرہ بولنے والے لوگوں اور یہاں کے پہلے سے رہنے والے باشندوں کے درمیان بول چال کا جو سلسلہ رفتہ رفتہ قائم ہوا اس نے آگے چل کر ہماری زبان کی صورت اختیار کر لی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ روی داس، میرا بائی، تلسی داس، سورداس، رحمٰن، جائسی وغیرہ ہندی کوی اس زمانے میں بھی دیوناگری رسم الخط میں کویتا لکھ رہے تھے۔ ایسی صورت میں ہماری زبان کو اگر اردو کا نام مل گیا یا دے دیا گیا تو میں سمجھتا ہوں اس میں کچھ ایسی برائی بھی نہیں ہے۔ ایک الگ، آزاد، اپنے پاؤں (رسم الخط) پر کھڑی مکمل زبان تو معرض وجود میں آ گئی۔ اب ترکی لفظ اردو کے معنی لشکر، بازار، شاہی کیمپ اور دربار ہیں یا فوج اور لشکر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو اس لفظ کے مذکورہ تمام معانی جائز اور درست ہیں۔ رہی بات یہ کہ رفتہ رفتہ اردو والے بھی ہماری زبان یعنی اردو کو فوجی اور لشکری زبان سمجھنے لگے تو آج کی تاریخ میں ان باتوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ جس زبان میں چکبست، دتاتریہ کیفی، دیا شنکر نسیم، آنند نرائن مُلّا، فراق گورکھپوری، بلراج کومل، بانی، کمار پاشی، کرشن کمار طور، پریم کمار نظر جیسے شعرا اور کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی، رام لعل، بلونت سنگھ، رتن سنگھ، بلراج مینرا، جوگندر پال اور سریندر پرکاش جیسے افسانہ نگار ہوں وہ زبان اگر تاریخ کے کسی مرحلے میں لشکری اور فوجی زبان بھی رہی ہو تو کیا؟ سبھی زبانیں وقت اور تواریخ کے منفی مثبت مرحلوں سے گزر کر ہی ترقی کرتی ہیں۔

میرے خیال میں ہماری زبان کے لیے اردو ہی موزوں ترین نام ہے۔ اگر اس زبان کا نام آج تک ہندی ہی ہوتا تو پرتپال سنگھ بیتاب شاید پنجابی زبان کا شاعر ہوتا۔ پاکستان کی سرکاری زبان شاید پنجابی ہوتی۔ ہندی زبان شاید دو لکھاوٹوں والی ایک بھاشا ہوتی۔

تواریخ کے الگ الگ ادوار ہیں، ہمارے پیش رووں کے کارناموں پر فخر کرنے یا پشیمان ہونے سے بہتر ہوتا ہے آئندہ نسلوں کے لیے رہنما نقوش پا چھوڑے جائیں۔ ذرا سوچیے آج کی تاریخ میں زبان اردو کا نام بدل کر ہندی کر دینے کی تجویز اگر کسی طرف سے پیش کی جائے تو اس کے نتائج ہندوستان میں کیا ہوں گے پاکستان میں کیا ہوں گے۔ داغ کے مشہور زمانہ شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

■ محفوظ عالم، رسالدار نگر، رانچی

''اردو دنیا'' ماہ ستمبر 2008 میں شائع جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں'' بہت کچھ کہتا ہے۔ اب تو اردو زبان کا رسم الخط تبدیل کرنے کی وکالت کرنے والوں کو خاموش ہو جانا چاہیے۔ انھیں اتنا تو سمجھنا ہی چاہیے کہ رسم الخط ہی کسی زبان کی روح ہوتا ہے۔ جب روح ہی نکل جائے تو خوبصورت جسم کس کام کا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم اردو والے اپنی زبان کے تئیں بیدار نہیں ہیں۔ ہم غیر ملکی زبان سیکھنے کے لیے تو بہت تگ و دو کرتے ہیں مگر بے چاری اردو پر چند گھنٹے بھی صرف نہیں کرتے۔ ہم سفر میں بھی اردو اخبارات اور رسالوں کا مطالعہ کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں بلکہ کئی حضرات تو ایسے مل جائیں گے جو فخر سے کہتے ہیں کہ میرے بچے اردو زبان نہیں جانتے مگر وہ انگریزی، اٹالین، روسی، فرینچ وغیرہ جانتے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو رسم الخط میں تبدیلی کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کوشش ہونی چاہیے کہ کاہلی اور احساس کمتری چھوڑ کر اردو زبان کا مطالعہ اس کی

"روح" (رسم الخط) کے ساتھ کیا جائے۔

■ **سید معین الدین علوی (ملیگ)، 4/597، میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ**

ستمبر 2008 کے شمارے میں اطہر صدیقی کی کتاب "نشاط آبلہ پائی" پر حبیب الرحمٰن چغتائی صاحب کا تبصرہ باصرہ نواز ہوا۔ جہاں چغتائی صاحب نے ہر اعتبار سے اطہر صدیقی کے سفرناموں کو قابل ستائش سمجھا، عنوان کو پسند کیا اور مصنف کے سائنس داں ہونے اور ان کے مشاہدے کو سراہا وہیں چین کی عظیم دیوار کے ناپنے میں سہو کر گئے! کتاب کے صفحہ 79 پر صاف تحریر ہے کہ دیوار کی لمبائی پانچ چھ ہزار کلومیٹر ہے، پانچ چھ کلومیٹر نہیں۔ لفظ "ہزار" فاضل تبصرہ نگار کے قلم کی گرفت میں آنے سے رہ گیا اور دیوار کی لمبائی دوسرے سفرنامہ نگاروں کے مقابلے میں بہت کم رہ گئی۔ نتیجے میں چغتائی صاحب نے اطہر صدیقی کے مشاہدے کی صحت پر سوال اٹھا دیا۔ اطہر صدیقی نے انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے دیوار کی لمبائی صحیح لکھی ہے۔

■ **ڈاکٹر محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد -503002 آندھرا پردیش**

ستمبر 2008 کا "اردو دنیا" ہدست ہوا۔ بروقت ملنے پر خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ اس ماہ نامے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے کیونکہ اس میں کل ہند نوعیت کے علاوہ عالمی سطح کی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ستمبر 2008 کا شمارہ اپنے اندر گوناگوں خوبیاں لیے ہوئے ہے۔ "آپ کی بات" کالم سے رسالے کے قد وقامت کا تعین ہو جاتا ہے۔ "اردو دنیا" کے قارئین بے باک ہیں جو محسوس کرتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ رسالے کے کمزور پہلو نہ کے برابر ہیں، کوئی خامی نہیں ہے تو کہاں سے ڈھونڈ نکالیں۔ "ہماری بات" میں ملک کی آزادی کے 61 سال کے سفر کا محاکمہ کیا گیا ہے کہ ملک نے اقتصادی، سماجی اور سیاسی شعبوں میں کہاں تک ترقی کی۔ ہندوستانی سماج کی برائیوں اور بیماریوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ علاقائی جھگڑے، زبانوں کے مناقشے، فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں ہمہ جہت ترقی مضمر ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے صحیح کہا کہ اردو کا رسم الخط بدلنا نہیں چاہیے۔ میری دانست میں رسم الخط زبان کی جان اور روح کی مانند ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں رسم الخط کے تعلق سے بڑی بلیغ اور فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ علی رفاد فتیحی نے اردو لفظیات پر انقلاب 1857 کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ "اردو زبان کی تدریس میں ہمزہ کا تعین" (انیس چشتی) "سرسید کا تاریخی شعور" (آفتاب احمد آفاقی) بھی اچھے مضمون ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کا سرسید ایک ناقابل فراموش باب ہیں۔ درخشاں زریں نے مختصر مگر جامع انداز سے "کربلائی اور شخصی مرثیے" کے تعلق سے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ماحولیات اور سائنس کے تحت "صوتی آلودگی اور ہماری ذمے داریاں" اہم ہے۔ لوگ صوتی آلودگی کی چنداں پروا نہیں کرتے جبکہ یہ آلودگی بھی دوسری آلودگیوں سے کم ضرر رساں نہیں۔ کیریئر، ہماری مطبوعات، تبصرہ و تعارف معلومات سے مزین ہیں اور ادبی بصیرت عطا کرتے ہیں۔ بچوں کا گوشہ قائم رکھیں۔ آج کل بچوں کے ادب پر کم توجہ دی جارہی ہے۔ بچے زیادہ تر برقیاتی میڈیا پر ہی کہانیاں دیکھ سن رہے ہیں۔

■ **ایم۔ راگھوراؤ، ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا، مدھیہ پردیش**

"اردو دنیا" ستمبر 2008 کا شمارہ موصول ہوا، شکریہ۔ "آپ کی بات" کالم سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ بڑی دلچسپی سے "اردو دنیا" پڑھتے ہیں۔ آپ کی یہ میگزین صحیح معنوں میں اردو کی خدمت میں لگی ہے۔

"ہماری بات" میں آپ نے ہمیں اپنی ذمے داریوں کا احساس دلایا۔ شکریہ۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اردو رسم الخط میں تبدیلی کے خلاف ٹھوس دلیلیں دی ہیں۔ اردو والوں کو خود اپنی زبان کے فروغ کی کوشش کرنا چاہیے۔ جناب علقمہ شبلی سے بات چیت دلچسپ لگی۔ محمد علی ردولوی کی فطرت نگاری پر لکھا گیا صلاح الدین احمد صاحب کا مضمون بے حد پسند آیا۔ نذیر احمد یوسف کی کہانی "چھتری کی قیمت" بھی خوب ہے۔ کمپیوٹر سائنس، اور صحافت میں کیریئر سے متعلق مضامین معلومات سے بھرپور ہیں۔ تبصروں کے ذریعے نئی نئی کتابوں سے تعارف ہو جاتا ہے۔ ارشد عبدالحمید کی نظم "کمپیوٹر" بچوں نے بہت پسند کی ہوگی۔

■ **ظفر انصاری ظفر، 265، پیریار ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-67**

ستمبر 2008 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ماشاء اللہ رسالہ دن بہ دن ترقی سے ہم کنار ہو رہا ہے اور اس کے لیے اس کی مجلس ادارت کے تمام لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ "کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں" ان کی اردو دوستی پر دال ہے۔ اردو کا رسم الخط اس کی تہذیبی پہچان ہے جو لوگ اسے بدلنے کا مشورہ دے رہے ہیں وہ یقیناً اس کی تہذیبی پہچان کو مٹانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اس مقالے میں جن نکات پر روشنی ڈالی ہے ان پر ان لوگوں کو خاص طور سے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے جو اردو کے رسم الخط کو بدل دینے کی بات بار بار اٹھاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے تاریخی حوالے کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ جن لوگوں نے اردو کے رسم الخط بدلنے کی بات کہی ہے وہ لوگ دراصل اردو کے دشمن تھے۔ "ہماری بات" کے تحت اداریہ بھی خوب ہے۔ آپ نے ملک کی صورت حال اور یہاں کے شہریوں کی ذمے داریوں پر جس انداز میں روشنی ڈالی ہے، وہ یقیناً قابل عمل ہے۔

■ **سراج احمد، رمضانپورہ (مالیگاؤں) مہاراشٹر-423203**

میں پچھلے 8 سال سے "اردو دنیا" کا بلاناغہ مطالعہ کررہا ہوں۔ یقیناً یہ رسالہ اردو عوام کا صحیح ترجمان ہے۔ ماہ ستمبر کا شمارہ بھی روایتاً اپنی مثال آپ ہے

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ مہاراشٹر میں اردو میڈیم کے طلبہ کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں۔ 2007 میں UPSC کے نتیجے کا اعلان کیا گیا تو پورے مہاراشٹر کا اردو طبقہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ میرے اپنے شہر کے جناب محمد قیصر عبدالحق نے 32واں مقام حاصل کر کے نہ صرف مہاراشٹر کے پہلے IAS آفیسر بننے کا اعزاز حاصل کیا بلکہ موصوف نے اپنے پرچے اردو میں لکھ کر اردو طلبہ کو احساس کمتری سے نجات بھی دلائی۔ (غالباً 6 یا 7 سال بعد اردو کے ہی طالب علم نے یہ امتحان پاس کیا ہے)۔ میری گزارش ہے کہ اردو زبان میں اس طرح کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو ''اردو دنیا'' میں نمایاں کیا جائے جو یقیناً اردو کے طلبہ کے لیے حوصلہ افزا ہوگا۔

■ زمرد انصاری، ایس. پی. ایجوکیشن سینٹر، بابو پورہ کانپور

ایس. پی. ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے ایس. پی. ایجوکیشن سینٹر میں عرصۂ دراز سے ''اردو دنیا'' آتا ہے لیکن میرے مطالعے میں تقریباً آٹھ ماہ سے ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جسے تقریباً آدھی دنیا جانتی اور بولتی ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ماہنامہ ''اردو دنیا'' میں زبان وتعلیم، ادب و سائنس، ٹیکنالوجی، کیریئر وغیرہ موضوعات پر مضامین اپنے اندر معلومات کا بیش بہا خزانہ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہی ایک ایسا رسالہ ہے جو اردو کی اصل خدمت انجام دے رہا ہے۔ معلوماتی مضامین میں اضافہ کریں تو اور بھی بہتر ہوگا۔

■ شمس الدین ندوی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، اردو، فارسی، وشوا بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن (مغربی بنگال)

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' کی شہرت زمانۂ دراز سے ہمارے کانوں میں آرہی تھی جس کی وجہ سے میں اس کی تلاش وجستجو میں رہتا اور ملتے ہی بغور مطالعہ کرتا جس سے تمام طرح کے فوائد حاصل ہوتے لیکن جب سے میں نے اس کو جاری کروایا ہے ماہ ختم ہونے سے قبل ہی اس کا منتظر رہتا ہوں اور ملتے ہی سارے کام چھوڑ کر کافی دلجمعی سے اس کا مطالعہ کرتا ہوں جو ہماری تحقیقی بصیرت بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں اور اس میگزین کا کالم ''ادب'' میرے لیے بہت ہی مفید ہے۔

میں اس میگزین کی درازی عمر کے لیے دعاگو ہوں اور اس میگزین کے سجانے والوں کے لیے بھی دعاگو ہوں کہ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔

■ رضوان خان، سکریٹری ''بزم اردو'' 96 شیخ سرائے، سیتاپور-261001

''اردو دنیا'' روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ جس کے لیے پورا ادارہ لائق ستائش ہے۔ اردو دنیا کی تمام اہم خبریں اور سرگرمیاں اس خوبصورت ماہ نامے کی زینت بنتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کارگراں قدر میں محنت، لگن اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمام خوبیاں آپ لوگوں کو مالک کونین نے بخشی ہیں۔

ضلع سیتاپور کی ممتاز ادبی تنظیم ''بزمِ اردو سیتاپور'' کے سبھی اراکین اس خوبصورت و دلکش رسالے کے مداح ہیں اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کر کے علم اور معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ مضامین اور خبروں میں اکثر آپس میں تذکرہ وتبصرہ کرتے ہیں۔ بزم اردو سیتاپور کے تمام اراکین کی طرف سے نیک خواہشات قبول فرمائیں۔ ساتھ ہی حمید سعید کی مبارکباد بھی۔ ''اردو دنیا'' میں منظوم حصہ اگر بڑھا دیا جائے تو کیسا رہے گا؟

■ الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر، ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف کشمیر-190006

اگست کے شمارے میں سرور الہدیٰ کا مضمون کئی اعتبار سے میری دلچسپی کا مرکز رہا ہے اور کچھ جگہوں پر نظر رکی۔ اس میں فاضل مضمون نگار نے یہ سوالات قائم کیے ہیں کہ ''کیا ہمارے زمانے کے ادیبوں اور فن کاروں کو اپنی منزل کا پتہ ہے؟ کیا انھوں نے حیات اور کائنات کے سلسلے میں کوئی نظریہ قائم کیا ہے'' ان سوالات کے جواب پیش کرنے میں مضمون نگار نا کام ہوا ہے اور اگر ان کے تعلق سے بات کی بھی ہے تو یہ ان سوالات کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔

مذکورہ مضمون کا عنوان ''محمود ایاز اور جدیدیت'' کئی غلط فہمیوں کو راہ دیتا ہے۔ مضمون کے مواد کا تعلق'' محمود ایاز کی ادبی شخصیت اور سوغات کے اداریوں سے ہے جن میں محمود ایاز کے ادبی وتنقیدی سروکار ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن جدیدیت جس کی اردو میں ایک خاص روایت ہے اور ایک مخصوص دور سے متعلق ہے، کا محمود ایاز کی جدیدیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ سرور الہدیٰ کے نزدیک محمود ایاز کی جدیدیت اردو کی جدیدیت سے مختلف ہے تو پھر ''محمود ایاز اور جدیدیت'' کا عنوان کس رعایت سے ان کو سوجھا ہے اور جب مضمون نگار خود یہ کہتے ہیں کہ: ''اس مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ محمود ایاز کی جدیدیت بعد میں رونما ہونے والی جدیدیت سے کتنی مختلف ہے۔ تو اس کے باوجود یہ عنوان مقرر کرنا مضمون نگار کے تجاہل عارفانہ کا غماز ہے۔ ہاں ''محمود ایاز کی جدیدیت'' اچھا عنوان ہوسکتا تھا۔

■ سید عبدالباری آمبوری، چنئی

اردو کونسل کا سہ ماہی جریدہ شمارہ جولائی تا ستمبر باصرہ نواز ہوا۔ اس میں محترم سید حسن عباس صاحب کا مقالہ'' فارسی کا انقلابی شاعر فرخی یزدی'' نظر نواز ہوا۔ اس میں شاعر موصوف کے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ پیش فرما کر آپ نے ادب میں ایک نئے اسلوب کو جنم دیا ہے۔ اس کے لیے میں اپنی جانب سے اور ''فکر وتحقیق'' کے مجھ جیسے دوسرے قاریوں کی جانب سے آپ تینوں حضرات یعنی سید حسن عباس ڈاکٹر علی جاوید اور مخمور سعیدی صاحبان کا مشکور وممنون ہوں کہ آپ حضرات نے ایک نئی راہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کیا بعید کہ عام قاری ترجمہ پڑھتے پڑھتے خود فارسی کی طرف راغب ہو جائے۔ □□□

ہماری بات

تین سال بعد 13 اکتوبر کو قومی یک جہتی کونسل کی تیرھویں میٹنگ نئی دہلی میں ہوئی جس میں کونسل کے 145 معزز اراکین نے شرکت کی۔ شرکا میں ترقی پسند اتحاد کی چیئر پرسن محترمہ سونیا گاندھی، وزیر داخلہ شوراج پاٹل، وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ، وزیر ریل لالو پرساد یادو، سماج وادی پارٹی کے صدر ملائم سنگھ یادو اور جنرل سکریٹری امر سنگھ اور مارکسی لیڈر سیتارام یچوری بھی تھے۔

میٹنگ کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم منموہن سنگھ نے جو تقریر کی وہ ملک میں امن و اماں کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور اس تشویشناک بگاڑ کے اسباب وعلل پر بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ اڑیسہ، کرناٹک، آسام اور ملک کے متعدد دوسرے حصوں میں میں بڑھتے ہوئے نسلی تشدد، مذہبی منافرت اور علاقائی تعصب کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعظم نے ان کے تدارک کے لیے ایسے اقدامات پر زور دیا جو موثر بھی ہوں اور غلط فہمیاں پیدا کرنے والے بھی نہ ہوں۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ تخریب وتشدد پر قابو پانا اور دہشت گردانہ سرگرمیوں سے سختی سے نمٹنا ضروری ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بے گناہ لوگ اس کی زد میں نہ آئیں اور یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ کسی خاص فرقے یا طبقے کو عمداً نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اگر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کا تعصب برتا جارہا ہے تو اس سے سماج میں استحکام آنے کی بجائے انتشار اور افتراق پیدا ہوسکتا ہے جس کے دور رس نتائج بہت خراب ہوں گے۔ وزیر اعظم نے زور دے کر کہا کہ تخریبی طاقتوں پر قدغن لگانے کے لیے قومی اتحاد کو نہ صرف قائم رکھنا بلکہ بڑھاوا دینا بھی ضروری ہے۔ اگر ہم باہمی اتحاد کی فضا قائم رکھنے میں ناکام رہتے ہیں تو یہ ملک کے ان کروڑوں محنت کش عوام کے مفاد اور ایک پرسکون زندگی کے لیے ان کی خواہشات سے روگردانی کے مترادف ہوگا جو اس نشانے کے حصول کے لیے شب و روز کوشاں ہیں۔ ان کی یہ کوششیں خیرسگالی اور امن واماں کی فضا میں ہی بارآور ہوسکتی ہیں۔

وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں اس مشترکہ ثقافت کا بھی ذکر کیا جو ہمارے باہم کے اصولوں کی پیدا کردہ بھی ہے اور پروردہ بھی اور جس نے صدیوں سے ہندوستان کی رنگارنگ آبادی کو اتحاد و اتفاق کی ڈور میں باندھے رکھا ہے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے، جغرافیائی حدود کے اعتبار سے بھی اور آبادی کے لحاظ سے بھی۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کے جغرافیائی حالات مختلف ہیں اور حالات کے اس اختلاف کی وجہ سے رہن سہن کے طریقے اور خورونوش کی عادتیں بھی مختلف ہوگئی ہیں۔ آبادی مختلف نسلی گروہوں میں منقسم ہے اور ان میں سے ہر گروہ کی اپنی ترجیحات ہیں۔ ہندوستان بہت سے مذہبوں کا بھی گہوارہ ہے۔ یہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ، جینی سبھی آباد ہیں اور پھر ان سب کے ذیلی فرقے بھی ہیں۔ اس تنوع میں جب تضاد کے پہلو بھی شامل ہوجائیں، جو واقعتاً موجود ہیں تو باہمی نباہ کی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے: ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا پاس اور لحاظ اور ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ۔ ہندوستان کی صدیوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب جب یہاں کے رہنے والوں میں بھائی چارے کی فضا قائم ہوئی ہے ملک میں خوشحالی آئی ہے اور لوگوں نے سکھ چین کی سانس لی ہے لیکن جب جب باہمی اختلافات کو ہوا دی گئی ہے اور تفریق وتشدد کے شعلے بھڑکائے گئے ہیں، ہوا مسموم ہوگئی ہے، ایسی مسموم کہ سانس لینا دوبھر ہوجائے۔

ہندوستان کا آئین ہندوستانی آبادی کی رنگارنگی کو ملحوظ رکھ کر مدون کیا گیا ہے اور ہمارے آئین سازوں نے مخلصانہ کوشش کی ہے کہ یہاں کے ہر شہری کو برابر کے حقوق کی ضمانت دی جائے۔ آئینی دفعات کا نفاذ انتظامیہ کی ذمے داری ہے۔ ہماری انتظامیہ اس ذمے داری کو بڑی حد تک خوش اسلوبی سے نبھاتی رہی ہے مگر ادھر کچھ مدت سے اس کی کارکردگی پر انگلیاں اٹھنے لگی ہیں جو ایک تشویشناک امر ہے۔ انتظامیہ کے طرزِ عمل سے بدظنی اور بددلی کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگ پیش آمدہ ہر مسئلے کے لیے عدلیہ سے رجوع کرنے لگے ہیں اور اس طرح انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان جو حدِ فاصل آئین نے قائم کی ہے اس کے دھندلا جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔

انتظامیہ کی جانبدارانہ یا غیر ذمے دارانہ روش جمہوریت کے ایک اہم ستون کے انہدام کے مترادف ہے۔ جمہوری اداروں کے غیر موثر یا غیر معتبر ہوجانے سے جمہوری نظام کو جو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، وزیر اعظم نے بروقت اس کی طرف توجہ دلائی ہے جس پر فوری طور پر اور صدق دلی کے ساتھ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

●●●

رالف رسل جن کا 14 ستمبر کو لندن میں انتقال ہوگیا، اردو کے ایک زبردست عالم ہونے کے ساتھ ساتھ، انگلستان میں اردو کے سرگرم وکیل اور فعال سفیر بھی تھے۔ اردو ادب اور شاعری کے حوالے سے ان کی انگریزی کتابوں کا ذکر ہم مختصراً پچھلے شمارے میں کرچکے ہیں۔ اس شمارے میں جو مضامین شائع کیے جارہے ہیں ان سے ان کی ان خدمات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو انھوں نے اردو کی تدریس وتعلیم کے سلسلے میں انجام دیں۔ نہ صرف انگریزوں کی نئی نسل کے لیے بلکہ ان تارکین وطن کے بچوں کے لیے بھی جو انگلستان میں جابسے ہیں۔ یہ مضامین ''پرواز'' لندن کے ایک شمارے سے شکریے کے ساتھ نقل کیے جارہے ہیں۔ □□□

محمد گلسین

تعلیمی میدان میں صنفی امتیازات

عورت اور مرد پیدائشی لحاظ سے مساوی ہیں۔ اس کے باوجود عورت اور مرد کے درمیان امتیاز کیوں اور کس طرح پیدا ہوا۔ امتیاز کے اس عمل میں مرد طاقتور اور عورت کمزور کیوں ہوئی، ہزار ہا برس سے چلے آرہے سماجی نظام میں عورت پر مرد کو برتری اور فوقیت کیوں حاصل ہے؟ کہا جاتا ہے کہ عورت اور مرد ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں پہیے مساوی ہوں اور یکساں چلیں۔ لیکن مختلف مقامات مثلاً مدرسوں، کھیل کے میدانوں، کنبوں، بازاروں، سڑکوں پر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ہونے والے سلوک میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ سماج میں لڑکوں کو چست و چالاک، چاق و چوبند، دلیر، سخت مزاج اور پُر اعتماد تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لڑکیوں کو سست، نرم مزاج، کم عقل، کند ذہن اور پست سمجھا جاتا ہے۔

ہمارا معاشرتی نظام کچھ ایسا ہے کہ بچے کی پیدائش سے ہی صنفی امتیاز ذہن نشیں کرا دیا جاتا ہے۔ سماج میں موجود دیگر امتیازات میں سے صنفی امتیاز سب سے قدیم ہے۔ صنفی امتیاز کی بنیاد پر سماج میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں مواقع اور سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ آج کے بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ صنفی امتیاز کو مٹانے اور صنفی مساوات کو قائم کرنے میں عورتوں سے زیادہ مردوں کو سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ تعلیم گاہوں کے نظم و نسق میں صنفی امتیازات کا ذکر کیا جائے تو معلمین و معلمات حتیٰ کہ انتظامیہ بھی ان رجحانات سے بری نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ معلمین جنس اور صنف کے صحیح معنی و مفہوم اور ان کے مابین پائے جانے والے فرق سے آگاہ ہوں۔ جنسی فرق پیدائشی ہے جبکہ صنفی امتیاز معاشرے کی جانب سے متعین کردہ ہے۔ جنس عورت اور مرد کے درمیان جسمانی یا طبعی طور پر ایک نامیاتی فرق ہے۔ جبکہ صنف عورت اور مرد پر معاشرے کی جانب سے عائد کردہ ثقافتی نتیجہ جس کا کوئی حیاتیاتی یا سائنسی جواز نہیں ہے۔ صنفی امتیازات محض روایتی رسموں پر مبنی ہیں کسی سائنسی مشاہدے کا نتیجہ نہیں۔

تعلیمی میدان میں صنفی امتیازات کی کارفرمائی واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔

(1) روزمرہ زندگی میں بہت سی باتیں اور لکھے جانے والے کئی جملے ایسے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں جن سے بچوں کے ذہن میں یہ امتیازات جنم لیتے ہیں۔ مثلاً

☆ دنیا کا ہر کام مردوں ہی کا مرہون منت ہے
☆ دنیا میں قابل توجہ صرف مردوں ہی کی ذات ہے
☆ تمام اہم ایجادات مردوں ہی نے کی ہیں
☆ پائلٹ، پولیس مین، صدر مملکت وغیرہ مرد ہی ہو سکتے ہیں

(2) اکثر اساتذہ لڑکیوں سے مخاطب ہو کر اس طرح کی باتیں کرتے ہیں:

☆ تم بہت نرم مزاج ہو۔ لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے
☆ اس لباس میں تم بہت خوبصورت لگتی ہو
☆ تمھارا خط اچھا ہے۔ ایسا ہی لکھا کرو
☆ تم لڑکی ہو نا اس لیے اپنی کتابیں بہت نفاست سے رکھتی ہو
☆ تم نے جو چوڑیاں پہنی ہیں بہت خوبصورت ہیں کیا یہ سونے کی ہیں
☆ تم گڑیا کی طرح پیاری لگتی ہو
☆ شاباش تم نے بڑی اچھی رنگولی بنائی ہے

(3) اساتذہ جنھیں صنفی مساوات کا احساس نہیں اس قسم کے جملے استعمال کرتے ہیں

☆ لڑکیوں کی طرح کیوں رو رہے ہو
☆ لڑکیوں کی طرح مت شرماؤ
☆ سامنے آؤ لڑکیوں کی طرح پیچھے کیوں کھڑے ہو
☆ تم لڑکے ہو، چست و چالاک بنو لڑکیوں کی طرح کاہل نہیں
☆ لڑکے ہو کر ڈرتے ہو
☆ جاؤ جا کر چوڑیاں پہن لو
☆ لڑکیوں سے بھی بدتر ہو
☆ تمھیں تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ جا کر برتن صاف کرو
☆ یہ کون سا مشکل کام ہے چاہیں تو لڑکیاں ہی کر دیں
☆ لڑکوں کے ساتھ کیا مقابلہ آخر وہ لڑکے ہیں
☆ تم سے یہ کام نہیں ہو سکتا، لڑکوں کو بلاؤ
☆ لڑکی ہو کر کیا ایسا کرنا مناسب ہے
☆ لڑکیوں کی وجہ سے لڑکے خراب ہوتے ہیں
☆ عورتوں کی کمائی سے کیا فائدہ مردوں کی کمائی سے خاندان پلتا ہے
☆ تم کیوں عورتوں کو مرد بنانے پر تلے ہوئے ہو

☆ مردوں کو کیوں الزام دیتے ہو۔ عورت کی دشمن تو عورت ہے
☆ پڑھی لکھی لڑکیاں بہت بدتمیز ہوتی ہیں
☆ عورتیں طاقتور ہوجائیں تو مرد کہاں جائیں وغیرہ

(4) تعلیم گاہوں میں دستیاب مختلف تعلیمی وسائل مثلاً اساتذہ کا ٹائم ٹیبل، ثقافتی سرگرمیاں، کھیل کے میدان، تجربہ گاہ وغیرہ ان تمام وسائل سے زیادہ تر فائدہ لڑکوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ اساتذہ اس معاملے میں لڑکیوں پر کم ہی توجہ دیتے ہیں۔

(5) نصابی کتابوں کے مضامین، عنوانات، تصاویر، مثالوں وغیرہ میں مردوں کی اہمیت، افضلیت، ان صفات اور ان کے پیشوں کا ذکر زیادہ ہوتا رہا ہے۔ جبکہ عورتوں کا ذکر محض ان سے متعلق محاوروں اور کہاوتوں میں ہوا ہے۔ مثالی کردار بھی زیادہ تر مرد ہیں مثلاً بادشاہ، استاد، شہزادہ، خلیفہ وغیرہ۔ مشقی سوالات میں بھی مردوں کے بلند درجات اور عورتوں کی طرف سے ان کی اطاعت کا تذکرہ ہوا ہے۔

(6) خواتین کے حالات کو پیش کرنے میں ذرائع ابلاغ مثلاً اخبار، رسالے، فلم، ٹیلی ویژن وغیرہ اکثر منفی عکس پیش کرتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ بچوں اور بڑوں کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ اخبار اور رسالے ہوں یا فلم اور ٹیلی ویژن۔ سماج میں عورتوں کے مقام اور ان کے جذبات و احساسات کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتے۔ اس طرح ذرائع ابلاغ پہلے سے طے شدہ مفروضوں کے تحت صنفی امتیازات کو فروغ دیتے ہیں۔

(7) تعلیمی سرگرمیوں سے مختلف موقعوں پر معلمین کی رائے، ان کے رویے اور ان کے ردِ عمل کو یوں دیکھا گیا ہے:

سالانہ جلسے کی تیاری کے موقع پر لڑکوں سے کہا جائے گا:

☆ لڑکیوں کی طرح جلدی کیوں کر رہے ہو
☆ گھر جا کر تمھیں کوئی پکوان نہیں بنانا ہے
☆ دیر سے جانے پر تمھارے والدین نہیں ڈانٹیں گے
☆ آج یہیں سو جاؤ

تعلیمی تفریح کے موقع پر لڑکیوں کے حوالے سے

☆ لڑکیوں کے لیے علاحدہ انتظام کیا جائے
☆ لڑکیوں کے ساتھ جانے میں کافی دشواریاں درپیش ہوں گی
☆ لڑکیوں کو ساتھ لے جاتے ہوئے ہمیں ڈر لگتا ہے
☆ والدین لڑکوں کے ہمراہ اپنی لڑکیوں کو کس طرح بھیج سکتے ہیں

اسپیشل کلاس کے موقع پر لڑکیوں سے کہا جائے گا:

☆ تعلیم حاصل کر کے تمھیں کوئی رینک نہیں لینا ہے
☆ لڑکیاں سائنس اور تکنیکی تعلیم حاصل نہیں کرتیں
☆ لڑکیوں کا پڑھ لکھ کر برسرروزگار ہونا ضروری نہیں

لائبریری میں کہانیوں وغیرہ کی کتابیں طلب کرنے پر لڑکیوں سے کہا جائے گا:

☆ کتابیں لڑکوں کو دی جا چکی ہیں۔ تم بعد میں لے لینا
☆ تمھارا نصابی کتابیں پڑھ لینا ہی کافی ہے
☆ قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھ کر وقت برباد نہ کرو
☆ تمھاری کامیابی کے لیے میرے لکھائے نوٹس ہی کافی ہیں

اسکول کے آخری وقفے میں کھیل میں حصہ لینے کے موقع پر اعلان کیا جائے گا:

☆ لڑکیاں چاہیں تو گھر جا سکتی ہیں
☆ لڑکو آؤ، والی بال کھیلیں
☆ لڑکیاں چاہتی ہوں تو ٹینی کوئٹ کھیل سکتی ہیں
☆ لڑکیاں میدان کے آخری حصے میں کھیلیں وغیرہ

(7) بہت سی کہاوتیں اور محاورے بھی صنفی امتیازات کے مظہر ہیں، جیسے:

☆ عورتوں کی عقل ٹخنوں کے نیچے
☆ جورو کا غلام
☆ زن مرید
☆ زن، زر، زمین تینوں فتنوں کا باعث ہیں
☆ عورت کی زبان تلوار سے زیادہ تیز چلتی ہے
☆ آنسو عورت کا ہتھیار ہے
☆ روتی عورت، ہنستے مرد پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے

اس قسم کے نصاب اور اساتذہ کے طریقۂ تعلیم سے بچوں کے ذہن میں یہ تصور قائم ہو جاتا ہے کہ صرف لڑکے یا مرد ہی طاقتور، عقل مند، بردبار اور اعلیٰ صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ اس غلط تصور کو بچوں کے ذہن سے دور کرنے اور صنفی مساوات کو قائم کرنے کے لیے اساتذہ کو مسلسل کوشش کرنی چاہیے اور اس میں بھرپور دلچسپی لینی چاہیے۔ صنفی مساوات کے قیام کے لیے اسکول کی سرگرمیوں میں تبدیلی لائی جانی چاہیے اور اس میں صدر مدرس کا بھرپور تعاون حاصل ہونا چاہیے۔ اس طرح لڑکیوں میں خود اعتمادی اور خود اختیاری کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

□□□

پتہ:
Dist. Institute of Education & Training (DIET)
Naubad, BIDAR-585403

وسیم بیگم

اردو اور فاصلاتی نظامِ تعلیم

فاصلاتی نظام تعلیم میں طلبہ کو کسی یونیورسٹی یا کالج میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تعلیم وہ اپنے گھر پر رہ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ عمر کی بھی اس میں قید نہیں ہوتی۔ اٹھارہ سال سے بڑی عمر کا کوئی بھی طالب علم ڈگری کورس میں داخلہ لے سکتا ہے۔

ہمارا ملک ہندوستان اپنے رقبے اور اپنی آبادی دونوں لحاظ سے بہت بڑا ملک ہے اور یہاں کی آبادی کا تقریباً 70% فی صدی حصہ دیہات اور قصبات میں رہتا ہے۔

ہندوستان چوبیس مختلف ریاستوں میں منقسم ہے اور ہر صوبے میں طلبہ کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے کیونکہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بچہ اپنی مادری زبان میں جتنی جلدی سیکھ سکتا ہے وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے۔

پورے ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں ہے جہاں کی مادری زبان اردو تسلیم کی گئی ہو۔ اس زبان کو بولنے والے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور جیسا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے، اردو بولنے والی آبادی کا بہت بڑا حصہ پچھڑا ہوا ہے اور غریبی کی نچلی سطح پر زندگی گزار رہا ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ تعلیم کی کمی اور اپنی مادری زبان سے دوری ہے۔

دنیا کی کوئی بھی زبان ہو اس میں اس کی صدیوں پر پھیلی ہوئی تہذیب اور اس کا تمدن شامل ہوتا ہے۔ اردو زبان میں جو اتنی مٹھاس، لوچ اور لچک ہے وہ اس مشترکہ ثقافت کی دین ہے جس کی یہ زبان ترجمانی کرتی ہے۔ اردو غزل کے جادو سے متاثر ہو کر بھی غزلیں کہی جانے لگی ہیں لیکن ان میں اردو غزل کی سی کیفیت نہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی غزلیں کہی جانے لگی ہیں لیکن ان میں اردو غزل کی سی کیفیت نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں کے پس منظر میں وہ مشترکہ ثقافت اور تہذیب موجود نہیں جس سے اردو زبان کا خمیر اٹھا ہے۔

شمالی ہندوستان میں اردو زبان کی حالت زیادہ خستہ ہے۔ اس پورے خطے میں آبادی کے لحاظ سے اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے اور جو اسکول ہیں وہ بھی برائے نام ہیں۔ ان اسکولوں میں مشکل سے ایک سیکشن اردو میڈیم کا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو انھیں اردو زبان میں درسی کتابیں مہیا ہوتی ہیں اور نہ اردو میڈیم ٹیچر۔ نتیجے کے طور پر طلبہ بورڈ کے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں اور مایوس ہو کر اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سے اقدام کیے جائیں جن سے اس اقلیتی طبقے کو تعلیمی ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکول" اہم خدمات انجام دے رہا ہے لیکن اردو زبان والوں کے لیے وہ اتنا کارآمد نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک اور ایسے ہی انسٹی ٹیوٹ کی ضرورت ہے جس کا ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہو، انگریزی، حساب، سائنس، سوشل سائنس وغیرہ مضامین طلبہ اپنی مرضی کے مطابق چن سکیں۔ اس طرح کے اوپن یا فاصلاتی نظام تعلیم سے طلبہ پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس طرح کی تعلیم سے یہ فائدہ ہوگا کہ جو طلبہ دن میں کوئی کام کرتے ہیں وہ شام کو اپنے گھر آ کر کورس کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جو طلبہ دسویں کلاس کا بورڈ کا امتحان پاس نہیں کر سکتے ہیں ان کو بھی اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع فراہم ہو سکتا ہے۔

ہمارے دیہات اور قصبات میں لڑکیوں کی شادی چھوٹی عمر میں کر دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں کی سوچ اب تک یہ ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنانے سے کوئی فائدہ نہیں ان کی تو بس شادی کر دینی ہے اور ان کو اپنی سسرال جا کر گھر کا کام کرنا ہے۔ کچھ خاندانوں کا سوچنا یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر لڑکیوں کو تعلیم دی جائے گی تو وہ آزاد خیال ہو جائیں گی اور بے راہ روی کی طرف چلی جائیں گی۔

اس طبقے کے لڑکوں کی حالت بھی بہتر نہیں کہی جا سکتی۔ وہ پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے۔ والدین بھی سوچتے ہیں کہ ان کی تعلیم پر روپے خرچ کرنے سے کیا فائدہ۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ ان کو کسی کام میں لگایا جائے تا کہ گھر کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ چنانچہ لڑکے اپنی تعلیم کو چھوڑ کر کام کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

طلبہ میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ہم سب کو ہر سطح پر محنت کرنی پڑے گی۔ دیہات اور قصبات میں جا کر وہاں کے بڑوں اور بزرگوں کی سوچ کو بدلنا پڑے گا تا کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں۔ ان قصبات اور دیہات میں Open School قائم کیے جائیں تا کہ طلبہ کا جو

رشتہ تعلیم سے ٹوٹ چکا ہو اس کو پھر سے استوار کیا جاسکے۔

ہندوستان کے بہت سے دیہات اور قصبات ایسے ہیں جہاں کسان بھوک سے خودکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ روز بروز ان حادثات کا گراف بڑھتا جارہا ہے۔ تو جہاں پیٹ بھرنے کو روٹی نہیں ملے گی، وہاں طالب علم سے تعلیم حاصل کرنے کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ اس سطح پر ہم کو طلبہ کی مدد اس طرح کرنی ہوگی کہ وہ اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھ سکیں اور تعلیم کا بوجھ بھی ان کے خاندان پر نہ پڑے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری اور نیم سرکاری تنظیمیں سامنے آئیں اور پرائمری سطح سے سینئر سیکنڈری اسکول تک ایسے طلبہ کو جو معاشی طور پر بہت کمزور ہیں مفت تعلیم کی سہولیات مہیا کرائی جائیں۔ ان کو مفت کتابیں اور یونیفارم فراہم کی جاسکتی ہیں۔ ان کے کھانے پینے کا بھی اس طرح انتظام کیا جائے کہ وہ بنا کسی معاشی فکر کے اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکیں۔ حکومت اس سلسلے میں شروعات کر چکی ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکول، مڈل، سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سطح پر تعلیم کا انتظام پورے ملک میں بڑے پیمانے پر کراتا ہے۔ اس اوپن اسکول میں یہ پابندی بھی نہیں ہے کہ ایک جماعت کے تمام مضامین کے امتحانات ایک ساتھ دیے جائیں۔ طلبہ ایک بار میں ایک مضمون کا امتحان بھی دے سکتے ہیں اور ایک جماعت کو کم از کم ایک سال میں اور زیادہ سے زیادہ پانچ سال میں پاس کرسکتے ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ایسے طلبہ کے لیے ایک اور بہت اچھا موقع فراہم کیا ہے کہ وہ طلبہ جو کسی وجہ سے سینئر سیکنڈری اسکول پاس نہیں کرسکے ہیں اور ان کے پاس کسی بھی سطح کا کوئی اسکولی سرٹیفکیٹ موجود نہیں ہے، ان کا ایک اہلیتی امتحان یا Eligibility Test لیا جاتا ہے۔ جو سینئر سیکنڈری سطح کا ہوتا ہے جو طلبہ اس ٹیسٹ کو پاس کرلیتے ہیں، یونیورسٹی ان طلبہ کو براہ راست ڈگری کورس میں داخلہ دے دیتی ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اردو اسی لیے ہے کہ ہندوستان میں وہ اقلیتی طبقہ جس کی مادری زبان اردو ہے اسے اپنی مادری زبان میں Higer اور Professional Education حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جاسکیں۔ اس یونیورسٹی میں طالبات کی تعداد 52% سے زیادہ ہے کیونکہ وہ لڑکیاں جو پردہ سسٹم کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں وہ بھی اس فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہیں۔

اس طرح یہ اقلیتی طبقہ جو ملک میں سب سے زیادہ پچھڑا ہوا ہے، خود بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا اور ملک کی ترقی میں بھی اپنا حصہ ادا کرسکے گا۔

□□□

پتہ:
Asistant Regional Director,
MANUU, Delhi

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Coucil for Promotion of Urdu Language
Ministry of HRD, Dept. of Higher Education, Govt. of India
West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110 066
Ph.: 26109746, 26169416 Fax: 26108159 E-mail: urducouncil@rediffmail.com

قومی کتاب میلہ پٹنہ

تاریخ: 1 تا 16 نومبر 2008 وقت: 10 بجے دن سے شام 8 بجے تک مقام: گاندھی میدان، پٹنہ

قومی اردو کونسل کے اسٹال پر آپ کا خیر مقدم ہے، جہاں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں۔

مثلاً ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ثقافت، لسانیات، لغات، قواعد اور علم، کتب خانہ، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، مذہب، سماجیات، معاشیات، تجارت، سائنس و ٹکنالوجی، بچوں کا ادب (CBT in Urdu)، طب و معالجات۔

بیگ احساس

افسانہ اور انشائیہ کے حدود

انشائیہ، افسانے سے قدیم صنف ہے۔ افسانہ فکشن کی سب سے نوعمر صنف ہے لیکن انشائیے کی جڑیں لوگوں نے داستان میں تلاش کی ہیں۔ کسی نقاد نے ''سب رس'' سے وجہی کی ان غیر متعلق تحریروں کو جو داستان کے قصے سے الگ خاص موضوعات پر لکھی گئی ہیں، انشائیہ کہا۔ کسی نے انشائیے کا سلسلہ ''باغ و بہار'' اور ''فسانۂ عجائب'' سے ملایا۔ زیادہ تر انشائیے کے محققین اس پر متفق ہیں کہ اردو میں انشائیہ سرسید تحریک کی دین ہے۔ محمد حسین آزاد جن کا سرسید تحریک سے خاص تعلق نہ تھا، ان کی تصنیف ''نیرنگِ خیال'' کی تحریروں کو انشائیے کا نقش اول قرار دیا گیا۔ سرسید کے مضامین کو بھی Essay کہا جاتا تھا اور ''نیرنگ خیال'' کی تحریروں کو بھی۔ بعد میں انشائیہ، مضمون اور مقالے کے امتیازات متعین کیے گئے لیکن انشائیہ کی کوئی حتمی تعریف متعین نہیں ہوسکی۔

اردو کا اولین افسانہ تلاش کرنے کے لیے ہمارے نقادوں نے انشائیے کا رخ کیا اور سرسید کے مضمون ''امید کی خوشی'' کو پہلا افسانہ قرار دیا گیا۔ سجاد حیدر یلدرم جو رومانی تحریک کے نمایاں لکھنے والوں میں سے ہیں، ان کے انشائیوں ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''، ''حضرت دل کی سوانح عمری''، ''جہاں پھول کھلتے ہیں'' اور ''اگر میں صحرانشیں ہوتا'' کو افسانہ کہا گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ کیا افسانے اور انشائیے کے حدود ایک دوسرے سے ملتے ہیں؟

پہلے یہ دیکھ لیں کہ افسانہ کیا ہے؟

افسانے کی جو تعریف متعین کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ''کسی وقوع کی کوئی زمانی حرکت جو تاثر کی حامل ہو اور اس حرکت میں ربط اور تسلسل ہو، چاہے یہ تسلسل بے ترتیب ٹکڑوں کی شکل میں بکھرا ہی کیوں نہ ہو، قاری اس سے ایک تاثر قبول کرتا ہو۔ افسانہ ہے۔''

مختصر افسانے میں ایک واقعہ بھی ہوسکتا ہے اور کئی چھوٹے چھوٹے واقعات بھی ہوسکتے ہیں لیکن یہ واقعات ایک دوسرے میں پیوست ہونے چاہئیں۔ واقعہ یا واقعات زندگی کے کسی بھی شعبے سے لیے جاسکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ مکمل ہوں۔ مختصر افسانہ ایک بھی غیر ضروری جملہ برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر واقعے کی حیثیت ایک اکائی کی بن جائے تو پھر یہی اکائی جذبے، احساس، تاثر، مقصد اور فن پر حاوی ہوتی ہے اور ان سب کے توازن کا نام مختصر افسانہ ہے۔ تدریسی سہولت کی خاطر اس کے اجزائے ترکیبی بھی متعین کردیے گئے۔ یعنی پلاٹ، کردار، مکالمہ، نقطۂ نظر اور وحدت تاثر وغیرہ۔ افسانے کا ارتقائی عمل اطمینان بخش رہا ہے۔ اس نے ہر تحریک اور ہر رجحان میں خود کو ڈھالا۔ رومانیت، حقیقت نگاری، اشتراکیت، جدیدیت اور اب مابعد جدیدیت۔ اجزائے ترکیبی سے انحراف بھی کیا گیا۔ جدید افسانے سے کہانی پن اور پلاٹ غائب ہوئے، کرداروں کے لیے بھی یہ ضروری نہیں رہا کہ وہ گوشت پوست کے ہوں۔ روایتی ربط اور وحدت کا بھی مقاطعہ کیا گیا، زمان و مکاں کا ماورائی تصور اور کسی حد تک انسان کا مابعد الطبیعیاتی تصور پیش کیا گیا۔ کہانی پر سوال قائم کردیا گیا لیکن اس صنف کے ارتقا پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

موجودہ صنعتی زندگی کی مصروفیت نے مختصر افسانے کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ رسائل کے فروغ اور طباعتی سہولتوں نے بھی مختصر افسانے کو بلندی پر پہنچایا۔

انشائیہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صنف ادب میں اس وجہ سے آئی ہے کہ لوگ اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لیے ایسی صنف کے متلاشی تھے جہاں اظہار خیال کی پوری آزادی ہو۔

انشائیے کے بارے میں جے. بی. مورٹن کا قول ہے کہ ''نثر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔''

ڈاکٹر جانسن نے انشائیہ کو انسانی دماغ کی ڈھیلی ڈھالی اور بے پرواقسم کی اڑان کہا۔ ڈاکٹر محمد حسنین انشائیہ کو من کی موج، ذہن کی پرواز، ناہموار فکر یا کسی بنیادی خیال کی بالیدہ شکل سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر پرویز کے مطابق انشائیہ میں مضمون نگاری کا شخصی انداز ملتا ہے، یہاں مصنف معلومات فراہم کرنے یا پیدائش و اموات کے رجسٹر مرتب کرنے کا کام نہیں کرتا۔ وزیر آغا انشائیہ نگار کے بارے میں لکھتے ہیں ''انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر کی چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست و تنگ لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ مونڈھے پر نیم دراز ہوکر حقے کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہوجاتا ہے۔'' مولانا صلاح الدین احمد نے انشائیے کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے ''انھیں پڑھ کر ناظر کی کیفیت کچھ اس بچے کی سی ہوجاتی ہے جو اسکول دیر سے پہنچا ہو اور جس نے گھر کا کام (ہوم ورک) بھی نہیں کیا لیکن اس کے ہاتھوں پر بید پڑنے کی بجائے الٹے برفی اور قلاقند کے دو بڑے لفافے تھما دیے جائیں۔''

ان تعریفوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشائیہ کے نقادوں نے بھی انشا پردازی سے کام لیا ہے۔ وزیر آغا بے تکلف گفتگو پر زور دیتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین اس اچانک خوشی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو خلاف توقع

حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسنین اس شے کا ذکر کرتے ہیں جو زندگی کی ٹھوس اور نا قابل انکار حقیقتوں میں گم ہے۔ وہ شے کیا ہے؟ کیا انشائیہ احباب کی گفتگو ہے؟ ان وضاحتوں سے اور الجھن پیدا ہوتی ہے۔

انشائیے اور افسانے کے فرق کی وضاحت کے لیے انشائیے کے نقاد یہ کہتے ہیں کہ انشائیہ نگار اپنے مضمون کے لیے پلاٹ نہیں بناتا۔ وہ اس کا پورا ڈھانچہ تیار نہیں کرتا، اس کی حتمی تصویر اس کے ذہن میں موجود نہیں ہوتی۔ وہ اس کے انجام سے واقف نہیں ہوتا۔ ایک خیال اس کے ذہن میں آتا ہے اور اس کے داخلی احساسات خیال سے رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔

سوچیے تو پلاٹ سے ہٹ کر ہر تخلیق کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ کاغذ پر منتقل ہوتے ہوتے افسانہ بھی کیا سے کیا ہو جاتا ہے، طے شدہ انجام بھی بدل جاتا ہے اور واقعات بھی۔

ڈاکٹر حسنین کہانی کے اجزائے ثلاثہ (پلاٹ کردار، زمان ومکاں) کو انشائیے میں استعمال کرنے کے سخت مخالف ہیں۔ وہ انشائیے کی دل کشی کی اصل وجہ انتشار خیال اور ذہنی آوارگی کو سمجھتے ہیں۔ وہ محاضرات (چھوٹے چھوٹے واقعات) اور تاثرات کو انشائیے کی روح قرار دیتے ہیں۔

پلاٹ واقعات کی تنظیم کو کہتے ہیں۔ کیا انشائیہ نگار قصداً اس تنظیم میں انتشار پیدا کرتا ہے اور بات میں بات پیدا کرتا ہے؟ کردار سے نظم تک چھٹکارا نہ پا سکی تو انشائیہ کیسے بغیر کردار کے لکھا جا سکتا ہے؟ کوئی بھی صنف زماں اور مکاں کے کیپسول سے باہر نہیں آ سکتی ہر تخلیقی یا غیر تخلیقی تحریر اپنے عہد کی پیداوار ہوتی ہے۔ اس کا عہد اس کے بطون سے ضرور جھلکتا ہے۔ جیسے پطرس کی ''سائیکل'' اور رشید احمد صدیقی کی ''چارپائی'' اب منظر نامے سے غائب ہو رہی ہے۔ جس طرح آج کی نسل آنگن، صحن جیسے لفظوں اور مہتر جیسے پیشوں سے ناواقف ہے اسی طرح بہت جلد سائیکل اور چارپائی بھی نئی نسل کے لیے نامانوس الفاظ اور اشیا ہوں گے۔

ڈاکٹر سلیم اختر افسانے اور انشائیے کے فرق پر طویل بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ افسانہ نگار اچھے اسلوب میں افسانہ نہ بھی لکھے تو بھی واقعات یا کرداروں کی وجہ سے اس کا افسانہ پڑھا جا سکتا ہے لیکن انشائیہ نگار کو ایسی کوئی سہولت نہیں ہے اسے نہ دلائل سے کام لینا ہے اور نہ تاثرات سے، نہ کہانی سنانی ہے نہ کردار نگاری کے جوہر دکھانے ہیں بلکہ اسے تو بات کو اس انداز سے کہنا ہے گویا کوئی بات نہیں کہہ رہا۔ اس لیے سارا زور اسلوب پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات انشائیہ نگار عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم باتوں کو لیتا ہے اور انھیں ایک ایسے نئے انوکھے زاویے سے دکھاتا ہے کہ قطرے میں دجلہ دکھانے والی بات بن جاتی ہے۔''

بعض افسانوں پر انشائیے کی اور بعض انشائیوں پر افسانے کی تہمت کیوں لگائی گئی۔ وارث علوی کرشن چندر کے انشائیوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ان کے انشائیوں میں اکثر کہانی کا عنصر یا واقعہ نگاری اس طرح غالب ہوتی ہے کہ بطور انشائیہ کے ان سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔ انشائیہ ایک طباع ذہن کی لمحات فرصت میں آزاد خیال آفرینی ہے۔ واقعات کا غلبہ اسے افسانے کے دائرے میں لے آتا ہے۔''

(کرشن چندر کی افسانہ نگاری: اردو افسانہ (روایت اور مسائل، ص-329)

گویا انشائیہ میں واقعہ نگاری یا کہانی کا عنصر شامل ہو جائے تو وہ انشائیہ نہیں رہتا۔ واقعات کا غلبہ اسے افسانے کے حدود میں داخل کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب افسانہ نگار موضوع اور کہانی سے ہٹ کر آزاد خیالی کے ساتھ رنگین زبان استعمال کرنے لگتا ہے تو افسانہ انشائیے کے حدود میں آ جاتا ہے۔ رومانی تحریک کے زیر اثر لکھے گئے افسانوں میں کہانی کی لائن بہت باریک اور دھندلی ہوتی تھی اور افسانہ نگار اپنی زبان کا جادو جگانے لگتا تھا۔ مثلاً ''پیدا ہوتے وقت رونا بہت اچھا۔ مانا۔ مگر ناامیدی کے ساتھ مرنا؟ اس کی ضرورت سمجھ میں نہ آئی۔ میں ایک پر نشہ وداع کو تسکین وصال پر ترجیح دیتا ہوں اور یہی سبب ہے آہ! یہی سبب ہے کہ چاہتا ہوں کہ دغدغۂ حیات کو بہار کے پرشوق زمانے میں، جب پھول کھل رہے ہوں اور دنیا میری طرف ہنس رہی ہو اور میں دنیا کی طرف۔ ایسے وقت دنیا کو الوداع کہوں۔''

(سجاد حیدر یلدرم: جہاں پھول کھلتے ہیں)

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کا قلم اکثر بے قابو ہو جاتا تھا اور ''شاعرانہ نثر'' لکھنے لگتے تھے۔ ''پورے چاند کی رات'' ایک المیہ افسانہ ہے۔ ایک چھوٹی سی غلط فہمی دونوں مرکزی کرداروں کی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے اور کرشن چندر اس کا اختتام اس طرح کرتے ہیں۔

''اور وہ چاند حیرت اور مسرت سے کہہ رہا تھا، انسان مر جاتے ہیں لیکن زندگی نہیں مرتی، بہار ختم ہو جاتی ہے لیکن پھر دوسری بہار آ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں لیکن زندگی بڑی عظیم ہے، یہی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے یہ بہار تم نے دیکھی، اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہوگے لیکن زندگی بھی ہوگی اور محبت بھی ہوگی اور جوانی بھی ہوگی اور خوب صورتی بھی اور رعنائی اور معصومیت بھی۔'' (پورے چاند کی رات)

یہ خوبصورت نثر افسانے کا حصہ نہیں بن سکتی، کیوں کہ یہ نثری شاعری ہے اور شاعری کا بوجھ افسانہ نہیں اٹھا سکتا۔

جدید افسانے میں پلاٹ واقعات اور کردار کو نظر انداز کیا گیا، یا دھندلا کر دیا گیا اس لیے افسانے سے کہانی غائب ہو گئی۔ کردار باقی نہیں رہے۔ مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

''ہمارے ہاں افسانے پہلے وقوعے کی صورت تھا۔ پھر خارجی ماحول کا

عکس بنا اور اس کے بعد منٹو کے عہد میں صرف کردار کا تجزیہ رہ گیا اور اب سامنے کا منظر واقعات دھندلے اور کردار محض ہیولے ہیں۔"

جدید افسانہ نگاروں نے اسلوب پر زور دیا۔ ملفوظات، اقوال اور تصوف کی طرف مراجعت کی۔ افسانے میں تشبیہ، استعارہ، علامت اور اقوال کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی اس لیے جدید افسانہ انشائیے کے حدود چھونے لگا۔ یہ بھی شور اٹھا کہ افسانے اور شاعری کے حدود ٹوٹ رہے ہیں خصوصاً نظم اور افسانے کی حدیں۔!!

اتفاق سے نظم بھی شاعری کی ایسی صنف ہے جس کی نہ حتمی تعریف کی جا سکی اور نہ مخصوص ہیئت مقرر کی جا سکی۔ انشائیے کی جو صورت حال نثر میں ہے وہی شاعری میں نظم کی ہے لیکن نظم نے ارتقائی منزلیں طے کیں اور کئی ہیئتیں اختیار کیں۔ انشائیہ ایسا نہ کر سکا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں " کہانی کسی ایک نقطے " کسی ایک لمحے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک سلسلے کا نام ہے اس سلسلے میں زمانی ربط ہو سکتا ہے جو ایک کردار کے مختلف صورت حال سے دوچار ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ کہانی آگے بڑھنے کی ایک نوعیت اور بھی ہے کہانی قاری کے ذہن اور اس کے تجربے میں بھی آگے بڑھتی ہے۔ اس معنی میں اگر قاری کہانی پڑھنے سے انکار کر دے تو کہانی چاہے کاغذ پر موجود ہو لیکن قاری کے لیے موجود نہیں ہوتی۔ یا اگر قاری اسے پڑھ ہی ڈالے اور اس کے ذہن میں کہانی پن کی صورت پیدا نہ ہو، تا تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے افسانہ تو پڑھا لیکن کہانی نہیں پڑھی ایسی صورت میں افسانہ اس کے ذہن میں مضمون یعنی انشائیہ یا اظہار خیال یا Essay کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔"

(افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ " اردو افسانہ روایت اور مسائل ص-705)

یعنی اگر افسانے سے کہانی نکل جائے تو وہ انشائیہ یا Essay کی صورت اختیار کرے گا۔ نظیر صدیقی نے انشائیے کے متعلق کہا کہ " یہ وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔

انشائیہ ہو کہ افسانہ اس میں انسانی لگاؤ اور فکرمندی کے بغیر دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایسے افسانہ نگار جنھوں نے کہانی کے بنیادی تقاضوں کو فراموش کر کے پیرایۂ اظہار کو ہی مقصود بالذات سمجھ لیا ان کے بارے میں گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ " ایسی نابخت تحریروں کو نہ کہانی کہا جا سکتا ہے اور نہ انشائیہ " اگرچہ ایسے افسانوں میں جو کوشش ملتی ہے وہ انشاپردازی کے ذیل میں آتی ہے۔" (اردو افسانہ روایت اور مسائل صفحہ-742)

کہانی بیان کی جا سکتی ہے انشائیہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے جملوں سے لطف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انشائیے میں اقوال کی گنجائش ہے لیکن افسانے میں یہ گنجائش اس وقت نکلتی ہے جب اسے کوئی کردار کہے۔ جیسے رشید احمد صدیقی کے انشائیوں کے یہ منتخب اقوال:

1. جو عبادت خدمتِ خلق سے عاری ہو وہ عمرِ رائیگاں ہے
2. جہاں طالب علم صحت مند ہے وہاں معاشرہ معتبر و مستحکم ہے
3. اگر انسان کو بدترین دشمن کی تلاش ہو تو اس کو اپنے عزیزوں میں مل جائیں گے
4. نشاط بری چیز نہیں ہے بلکہ نشاط سے مغلوب یا اس کا محتاج ہونا بزدلی اور کم مایگی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے کئی جملے پڑھنے والوں کو ازبر ہیں۔ مثلاً " وہ شعر ہی کیا جو بیک وقت ہزاروں لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔ " وغیرہ

انشائیہ، اقوال اور خوب صورت جملوں کی وجہ سے یاد رہتا ہے اور افسانہ اس کی کہانی اور تکنیک کی وجہ سے۔

تکنیک کا جہاں تک سوال ہے۔ افسانے میں صیغے کے لحاظ سے ماضی، حال، مستقبل، متکلم، غائب، مخاطب کی تفریق ہوتی ہے۔

صرف تصویر کشی یا بیان، ایسا بیان جس میں کہیں کہیں مکالمہ اور عمل ملا ہوا ہو اور صرف گفتگو یا مکالمہ۔ یہ سارے اجزا انشائیے میں بھی ہو سکتے ہیں لیکن انشائیے میں صیغۂ واحد متکلم کا استعمال قریب قریب ناگزیر ہے۔ بقول مشکور حسین یاد " اگر کوئی انشائیہ نگار واحد متکلم میں بات نہیں کرتا یا اس صیغے میں بات کرنا نہیں جانتا تو سمجھ لیجیے وہ انشائیہ نگار نہیں ہے۔ (ممکنات انشائیہ ص-75)

اصل میں انشائیہ نگار " میں " کے ذریعے اظہار ذات اور انکشاف شخصیت کرتا ہے۔ لیکن افسانے کا " میں " مصنف نہیں ہوتا بلکہ کوئی کردار ہوتا ہے۔

شعور کی رو جدید افسانہ اور ناول کی تکنیک کے اہم اجزا ہیں۔ اگر شعور کی رو سے بات کے پھیلتے دائرے مراد لیں تو انشائیہ میں بھی شعور کی رو ملتی ہے لیکن اسے شعور کی بہکی ہوئی رو سمجھنا چاہیے۔ شعور کی رو بہکتی ہے تو وہ پھر آزاد تلازمہ یا فینٹسی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شعور کی رو الجھتی ہے تو فن پارہ عدم ابلاغ کا شکار ہو جاتا ہے۔ انشائیہ عدم ابلاغ کا خطرہ نہیں مول سکتا۔ جب کہ تجریدی افسانے نے نہ صرف یہ خطرہ مول لیا بلکہ اس کے لیے معتوب بھی ہوا۔

افسانے اور انشائیے کی یہ وہ مماثلتیں اور اختلافات ہیں جو ان کے حدود متعین کرتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, University of Hyderabad
P.O. Central University of Campus,
Hyderabad-500046 (A.P.)

ذاکر فیضی

''آگ کا دریا'' میں ویدوں کے حوالے

قرۃ العین حیدر کے مشہور ناول ''آگ کا دریا'' میں ویدوں کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ مصنفہ نے مختلف مقامات پر مختلف کیفیات و جذبات کا اظہار ویدوں کے فلسفے کی روشنی میں کیا ہے، جیسے خوف کا فلسفہ، خودی کا فلسفہ، جانوروں کی قربانی کا فلسفہ، عمل و علم کا فلسفہ وغیرہ۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے شعور کی رو میں ''آگ کا دریا'' میں تاریخ اور تخیل کو باہم آمیز کر کے آگے بڑھایا ہے۔ تاریخی حقائق کے حوالے سے ناول کو آگے بڑھاتے ہوئے جب اندھیرا پھیلنے لگتا ہے تو اپنے تخیل سے فکشن کی روشنی پھیلا دیتی ہیں۔

واقعات کو براہِ راست بیان کر دینا تاریخ کا کام ہے لیکن ناول نگار اپنے ڈھنگ سے سوچتا ہے اور ناول کے سانچے میں ڈھالنے کے بعد حقیقت کو کہانی بناتا ہے۔ اس عمل میں ''آگ کا دریا'' میں ویدوں کا تذکرہ جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ مندرجۂ ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

''گوتم نیلمبر نے خوف کے جذبے کا اکثر تجزیہ کرنا چاہا تھا۔ زندگی کا خوف، زندہ رہنے کا خوف، رگ وید میں لکھا ہے کہ ابتدا میں خودی تھی، جو پرش کی شکل میں نمودار ہوئی۔''

(آگ کا دریا، ص-14، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

گوتم نیلمبر، جو ناول کے سب سے اہم کرداروں میں سے ایک ہے، اس کی زبانی قرۃ العین حیدر نے خودی کا فلسفہ پیش کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی وجود میں خودی کا وہی مقام ہے جو ایک مملکت میں حکمراں کا ہوتا ہے۔ تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں خودی کی خدمت کے لیے ہیں۔ نفس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خودی کے حضور میں اپنی خواہشات کو درخواست کے طور پر پیش کرے۔ فیصلہ خودی کے اختیار میں ہے کہ وہ نفس کی گزارشات میں سے کسے قبول کرے اور کسے رد کرے۔ آگے دیکھیں:

''بھگوت گیتا میں سری کرشن نے کہا کہ میرا کرتی کے کن اعمال پر ہر طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں لیکن خودی یہ سمجھتی ہے کہ سب پر میں ہوں۔ اکلیش نے کہا۔ اور شاکیہ منی نے پوچھا کہ کوئی محدود خودی ہے بھی یا نہیں۔ ممکن ہے یہ سب احساس کی مختلف کیفیتیں ہوں۔'' (ص-54)

''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین حیدر اپنے کرداروں کے حوالوں سے یہ پیغام دیتی نظر آتی ہیں کہ اس خودی میں جو خود خدا بن جائے اور اس خودی میں جو خدا کا حکم مانے فرق ہے۔ کامیاب زندگی کے لیے خودی کا قابو میں ہونا ضروری ہے۔ جو خودی بے لگام ہو جائے اور کسی احتساب کی پابند نہ ہو، وہ دنیا میں فرعون، شداد، نمرود، جیسے کردار ہی پیدا کر سکتی ہے۔

قرۃ العین حیدر زندگی کی معنویت پر زور دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''کوئی چیز بے معنی نہیں۔ خود اس لفظ ''بے معنی'' کے بھی معنی موجود ہیں۔'' (ص-355)

''الفاظ ختم کرو، معنی کے معنی موجود رہیں گے۔'' (ص-360)

لیکن وہ لفظوں کی اہمیت سے بھی بے خبر نہیں ہیں:

''تم کیسے فلسفی ہو جو الفاظ میں تعین نہیں رکھتے۔''

گوتم نے جھنجھلا کر جواب دیا — ''پانی تمھارے ٹکشلا کے استاد نے کہا تھا۔ اپنے یا دوسروں کے خیالات کے ترجمان صرف الفاظ ہی ہو سکتے ہیں۔ ان کی ماہیت کا مطالعہ کرنا کس طور ضروری ہے۔ الفاظ کے راستے کے بنا خالص خیال تک کس طرح پہنچ پاؤ گے۔ آواز الفاظ کا پراکرتک گن ہے اور مادہ ابدی ہے۔ وید زبان کی شکل میں بر ہما ہے اور مادہ بر ہما ہے۔'' (ص-23)

ویدوں کی تخلیق کس نے کی؟ یہ بہت مشکل سوال ہے۔ مانا جاتا ہے کہ وید آسمانی کلام ہیں اسی لیے انھیں دیووانی (देववाणी) بھی کہا جاتا ہے۔ پنڈت شری رام شرما اپنی کتاب ''تنتر مہاگیان'' میں لکھتے ہیں کہ ''آرین انسان سے وابستہ یہ سب سے پہلے بولے جانے والے الفاظ ہیں۔ ان کا تعلق دنیا اور ہندوستان کی تاریخ سے ہے۔ یہ پچھلی نسلوں کی یادگار ہیں۔ سناتنوں نے بھی اس کی کم و بیش شہادت دی ہے۔''

(حوالہ: کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو.... مولانا شمس نوید عثمانی، ص-71)

جانوروں کی قربانی کا تصور ہندو سماج میں غلط مانا جاتا ہے لیکن ویدوں کے مطابق جانوروں کی قربانی جائز ہے۔ ''آگ کا دریا'' میں اس کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیں:

''مجھے اہنسا کے متعلق بتاؤ۔''

''برہمن ہو کر اہنسا کے قائل ہونا چاہتے ہو؟'' ہری شنکر نے ہنس کر پوچھا۔ گوتم بھی ہنسا۔ ''ہاں بڑی عجیب بات ہے نا۔'' اس نے نظریں اٹھا کر شنکر کو دیکھا۔ ''جانوروں کو مارنا ہزاروں برس سے برہمنوں کا شغل رہا ہے۔ جب یہ آریہ مشرقی یوروپ اور وسط ایشیا کی چراگاہوں میں گھومتے تھے تب زندہ

رہنے کے لیے درندوں کا شکار ان کے لیے ضروری تھا۔ ان کی کوئی عبادت قربانی کے بغیر مکمل نہیں تھی۔ خود تخلیقِ کائنات، مابعد الطبیعیات کے نقطۂ نظر سے ایک عظیم آفاقی قربانی تھی۔ سام ویدوں کے اصولوں کے مطابق قربان گاہ ایک زبردست رمزیت کی حامل تھی اور کائنات کی کلیت اور اس کی بقا کی علامت تصور کی جاتی تھی۔ چکرورتی راجا کے لیے گھوڑے کی قربانی لازمی تھی۔

(ص-46)

قرۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' میں ویدوں کے حوالے سے دیگر فلسفوں کے ساتھ قربانی کا تصور بھی پیش کیا ہے۔ آرین نسلوں میں قربانی ''بلی'' اور ''بھینٹ'' کے نام سے ہوتی تھی۔

بغیر علم کے عمل کارآمد ثابت نہیں ہوتا اس لیے انسان کے لیے علم و عمل دونوں بے حد ضروری ہیں۔ اس تعلق سے ''آگ کا دریا'' میں ویدوں کے حوالے سے قرۃ العین حیدر کہتی ہیں:

''عمل کے راستے کا بیان قدیم ویدوں میں تھا اور کلپ شاستروں اور دھرم شاستروں اور مہابھارت اور پرانوں میں اس کا مذکور تھا۔ مہابھارت میں سری کرشن نے ارجن کو عمل کی راہ دکھائی تھی۔'' (ص-153)

''دوسرا راستہ علم کا تھا۔ ویدک عہد کے بعد کے حکما نے طے کیا تھا کہ محض عمل سے نجات ممکن نہیں۔ خود عمل کی ماہیت کیا ہے، یہ جاننا چاہیے۔ یہ کھوج لگانے کا راستہ بہت طویل تھا۔ اپنشدوں میں کسی ایسے طریقے کی تحقیق شروع کی گئی تھی جس سے علت و معلول کا چکر ٹوٹ سکے۔'' (ص-153)

یہ دنیا کارزارِ عمل ہے۔ باعمل زندگی زندگی ہے اور بے عمل زندگی موت، انھی خیالات کا اظہار قرۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' میں مختلف واقعات اور کرداروں کے ذریعے کیا ہے۔ ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ناول کے کردار اپنی آتما کی تلاش میں در بدر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ چمپا، کمال، سرل، شنکر اور گوتم نیلمبر ہر دور میں موجود ہیں اور ان کی تلاش نا تمام ہے:

''ویدوں میں آیا ہے کہ آتما کو اپنی خواہشوں کے زیرِ اثر کائنات سراب کی ایسی دکھلائی پڑتی ہے۔ جس طرح سے پیاسے ہرن کو ریگستان میں ندیاں نظر آتی ہیں۔ اس مرگ ترشنا نے مجھ کو'' ہری کو بہت پریشان کیا تھا۔''

(ص-78)

ناول کے اہم کرداروں میں گوتم نیلمبر، شنکر، چمپا، کمال اور سرل وغیرہ ہیں۔ یہ سب حقیقت پسند اور انسان دوست ہیں۔ گوتم اگر ایک مفکر ہے تو کمال ایک دردمند دل کا نوجوان۔ چمپا کا کردار بھی بہت اہم ہے جو گوتم اور کمال کی طرح ہر دور میں موجود ہے۔ چمپا جو پہلے دور میں چمپک تھی دوسرے دور میں چمپا اور اس کے بعد چمپا بائی اور پھر چمپا احمد یعنی چمپا باجی ہو جاتی ہے۔ یہ سبھی کردار سکون کی تلاش میں جگہ جگہ جاتے ہیں، مگر عمریں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی تلاش ختم نہیں ہوتی۔

یہ کیسی تلاش کیا ہے؟ وہ کس سکون کی تلاش میں ہیں؟ قرۃ العین حیدر کو اپنے کرداروں کے جذبات و احساسات کو اُجاگر کرنے میں کمال حاصل ہے۔ جذبات و احساسات کی تہیں کھولنے کے لیے انھوں نے تاریخ کا سہارا لیا ہے اور فلسفے کا بھی۔ ویدوں سے دلچسپی بھی ان کی اسی لگن کو ظاہر کرتی ہے۔

''آگ کا دریا'' کا اسلوب شگفتہ اور زبان رواں دواں ہے۔ واقعات کو پیش کرنے کے لیے جو خوابناک فضا تیار کی گئی ہے۔ وہ قاری کو اپنے آپ میں محو کر لیتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے کہ بیچ بیچ میں آئے یہ فلسفے ناول کی روانی میں خلل ڈال رہے ہیں۔ کہیں کہیں لگتا ہے جیسے ''گوتم''، شنکر، کمال، چمپا، سرل جیسے کردار اور کلکتہ، بنارس، لکھنؤ، لندن، کیمبرج، جیسے مقامات خود قرۃ العین کی پرچھائیاں ہیں، ان کے خواب و خیال کے سائے ہیں۔

❑❑❑

پتہ:
Kala Piyada,Sambhli Gate,
Moradabad (U.P.) 244001

کلیات سعادت حسن منٹو، جلد دوم

مرتب: شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو کے افسانوں کے سحر نے لوگوں کو ان کے روایتی افسانہ نگاری سے انحراف، موضوعات کے انتخاب، تکنیک کے تنوع، زبان کی شکست و ریخت کے تجربے، اہم فکر کو سہل انداز میں بیان کرنے کے سلیقے اور کہانی گھڑنے کے ہنر جیسی صلاحیتوں کی طرف متوجہ ہونے کا خاطر خواہ موقع نہیں دیا۔ منٹو نے افسانوں کے علاوہ ناول، ڈرامے، خطوط، نیچر، فلم اسکرپٹ، خاکے اور مضامین بھی لکھے ہیں جن میں فنی حسن اور جذبے کی صداقت ان کے افسانوں سے کسی طور کم نہیں۔ کلیات کی اس دوسری جلد میں منٹو کی پانچ کتابیں ''افسانے اور ڈرامے''، ''چغد''، ''لذت سنگ''، ''سیاہ حاشیے'' اور ''خالی ڈبے خالی بوتلیں'' شامل ہیں۔

صفحات — 575، قیمت — 274 روپے

تحریر: مہاشویتا دیوی
ترجمہ: قیصر شمیم

طلاق

شادی کے بعد کلثوم نے اپنے باپ سے کہا تھا، ''بتاؤ تو بابا، کیا دیکھا تھا؟ زمین نہیں ہے، کھیت نہیں ہیں، بطخ، مرغی، کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا دیکھا آپ نے؟''

لیکن کلثوم کی سمجھ میں یہ بات بعد میں آئی کہ ارشد بڑے ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہے اور سر جھکا کر رہنا جانتا ہے۔ کلثوم سے اس نے کہا تھا، ''تمھارا باپ روپئے تو دے گا، مرغی پال کر، انڈے بیچ کر کیا پیٹ نہیں بھر سکتا؟''

کلثوم کے باپ نے بیٹی کے ہاتھ میں روپئے دیے تھے۔ مرغیاں پال کر بطخیں پال کر، انڈے بیچ کر کلثوم جو کچھ پاتی، ہاتھ میں رکھتی۔ ارشد جسمانی طور پر بھوت کی طرح محنت و مشقت کرتا، ڈائمنڈ ہاربر میں انڈے مرغی بیچ کر جو پاتا، لاکر سب بیوی کو دے دیتا۔

اب کلثوم کے دل میں کوئی دکھ نہیں تھا۔ بڑی بہن کی طرح اس کے یہاں پان کی کھیتی نہیں تھی۔ چھوٹی بہن کی طرح اس کے پاس تین ہل بھی نہیں تھے، مگر اس کے گھر میں سکون تھا، آرام تھا۔

ارشد نے کلثوم سے کسی دن یہ نہیں کہا کہ وہ اپنی شرم و حیا تج کر گوبر اکٹھا کرتی پھرے یا جلانے کی لکڑیاں توڑ توڑ کر لائے۔ زندگی میں کبھی کلثوم کو دکان سے جا کر سودا سلف لانا نہیں پڑا۔ یہ دیکھ کر سب کلثوم سے حسد کرتے تھے۔ اس کا باپ گونو (غنی) کبھی کبھی آکر بیٹی کے گھر ایک دو دن رہتا تھا۔ کہتا تھا، ''یہاں بڑا سکون ہے بیٹی۔ بھوٹی اور ڈولی کے گھروں میں دولت کا ڈھیر ہے۔ بچے کچے بھی بہت ہیں، مگر......''

کلثوم کے بیٹے نے اسکول میں تعلیم حاصل کی، اسے جہاز میں نوکری ملی، اس کی شادی ہوئی اور وہ خضر پور ڈک کے علاقے میں چلا گیا۔ سب کہتے، چاپل(1) کے گونو نے تینوں بیٹیوں کی شادی تین طرح سے کی تھی۔ پھر بھی کولی (کلثوم) کو سکھ زیادہ ملا ہے، دیکھ لو، بیٹا بھی کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا! کیوں نہ ہوتا بھلا؟ باپ لڑکے کو اسکول میں چھوڑنے جاتا تھا، پھر اسے وہاں سے لے آتا تھا، خود تو ان پڑھ ہے، لیکن لڑکے کو روزانہ لالٹین جلا کر اور دری بچھا کر پڑھنے کو بٹھاتا تھا۔ واقعی کولی کی قسمت بہت اچھی ہے!

سب کہتے ہیں، ''کولی کی قسمت بہت اچھی ہے، کولی اپنے بیٹے کے روپئے زمین میں گاڑے ہوئے پیتل کے گھڑے میں جمع کرتی ہے اور خود انڈے بیچ کر گھر چلاتی ہے۔ اب کے، برسات سے پہلے ہی اپنے گھر پر چھپّر ڈلوائے گی اور ایک دوسرا گھر بنوائے گی۔'' لیکن اچانک اس کا خواب اس دن خاک میں مل گیا، جب ارشد نے پاس پڑوس کے لوگوں کے سامنے ایک ہی سانس میں اسے تین بار طلاق دے دی!

اسی ارشد نے کبھی کہا تھا، ''زبان بند نہیں رکھ سکتی؟ کچھ نہ کچھ بولنا کیا ضروری ہے؟ کیا یہ نہیں جانتی کہ ایک ہی بات سے بھائی بھائی میں خون خرابہ ہو جاتا ہے، ایک تیلی سے پوال میں آگ لگ جاتی ہے؟''

اب اسی ارشد کو دیکھو، پوتا بیمار ہے تو صرف اس بات پر کولی سے جھگڑ پڑا کہ وہ اپنے پوتے کو ہومیوپیتھ ڈاکٹر کو دکھائے یا کسی بڑے ڈاکٹر کو؟

کولی نے تو صرف یہ کہا تھا۔ ''یہیں سُمل (2) کی طرف نیتائی ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ اسے چھوڑ کر، یہ لوگ کلکتہ جا کر بڑے ڈاکٹر کو کیوں دکھائیں گے؟'' کولی کی بہو ارشد کے چچیرے بھائی کی بیٹی ہے۔ بہو کے باپ نے کہا، ''کیوں؟ جب تم لوگوں کے پاس روپئے پیسے ہیں تو نیتائی ڈاکٹر کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟''

ارشد نے کہا، ''میں اس عورت کی بات نہیں سنوں گا۔ میرے اپنے بیٹے کے بیٹے کا سوال ہے۔ اسے میں ڈائمنڈ ہاربر لے جاؤں گا۔''

کولی نے کہا۔ ''تمھارے پاس بے حساب پیسے ہیں۔ یہی بات ہے نا؟''

ارشد بولا، ''آخر تو نے گھر میں کس لیے روپئے گاڑ رکھے ہیں؟''

''تمھارے پوتے کے لیے گائے بیل خریدوں گی۔ یہ بتایا نہیں ہے؟''

''جان پہلے نہ دودھ کا بندوبست پہلے؟''

''ہاتھ میں اگر روپئے ہیں تو لے جاؤ، جا کر دکھاؤ۔''

''تمھارے روپئے ہیں۔ اسی لیے گرمی چڑھ گئی ہے؟''

''ایسی بات ہے مردوا(3) کھوکے؟''

ارشد طیش میں آکر چلانے لگا۔ کولی نے بھی چیخ چیخ کر آس پاس کے لوگوں کو جمع کرلیا۔ تبھی ارشد نے اکڑ کر کہا، ''جا، تجھے طلاق دیتا ہوں۔''

''طلاق دیتے ہو؟''

''ہاں، دیتا ہوں'' ارشد نے چیخ کر کہا، ''طلاق! طلاق! طلاق!''

برطانوی اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے مناسب اور موزوں کتابوں کی جو کمی ہوتی ہے اس پر سوچ بچار کرے اور اس کمی کو دور کرنے کے لیے عملی اقدامات کرے۔ مانچسٹر میں اردو کے استادوں کے گروپ نے اپنے ہاں کے اسکولوں کے لیے کچھ ابتدائی کتابیں تیار کی ہیں اور اس سلسلے میں خاصا مفید کام ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، انجمن کی ایک میٹنگ میں طے پایا کہ ایک ''اردو نیوز لیٹر'' چھپنا چاہیے تاکہ اردو پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے اس کا دوسروں کو بھی پتا چلتا رہے۔ اب مسئلہ درمیان میں یہ آن پڑا کہ یہ ''نیوز لیٹر'' کون تیار کیا کرے اور اسے متعلقہ افراد اور انجمنوں تک پہنچانے کی ذمے داری کس کی ہو؟ ہم میں سے جو سگریٹ پیتے تھے انھوں نے سگریٹ او رپائپ والوں نے اپنے پائپ سلگا لیے اور ہر شخص ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ آخرکار وہ شخص جو نہ سگریٹ پیتا ہے اور نہ پائپ، اور جو اس طرح کے کاموں کے لیے کسی گہری سوچ اور ''اندیشہ ہائے دور دراز'' کا قائل نہیں اور جس کا نام رالف رسل ہے، آڑے آیا، اور بولا: یہ کام میں کر دیا کروں گا'' ہم سب نے عافیت کی سانس لی۔

اس انجمن کو بھی (جس کی افادیت اس کے نام ہی سے ظاہر ہے) متحرک رکھنے میں رالف رسل کا بڑا حصہ ہے ورنہ مجھ ایسے شاید محض ''نشستند و گفتند و برخاستند'' پر ہی مطمئن رہتے۔ رالف رسل جو خود ''جاوداں، پیہم دواں اور ہر دم جواں'' رہتے ہیں۔ دوسروں کو محض ''تصور جاناں کیے ہوئے'' بیٹھے نہیں دیکھ سکتے۔ ایک دفعہ میری جو شامت آئی تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ: ''میں اردو کا ایک قاعدہ لکھ رہا ہوں۔''

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قاعدہ واقعی لکھا گیا۔ رالف رسل نے اس میں کچھ اس طرح دلچسپی لی کہ مجھے خیریت اسی میں نظر آئی کہ یہ قاعدہ مکمل ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ رالف رسل صاحب سے جو تھوڑی بہت صاحب سلامت ہے وہ جاتی رہے گی۔

شروع شروع میں تو میں ان سے کہتا رہا کہ لکھ رہا ہوں، اب یہ کر رہا ہوں، اب وہ کر رہا ہوں۔ پھر ایک دن کہنے کو کچھ اور نہ سوجھا تو کہا:

''بس اب مکمل ہی سمجھیے، کسی دن آپ کو فرصت ہو تو دکھاؤں گا تاکہ آپ کی رائے معلوم ہو سکے۔''

چند ہی دن بعد ان کا ٹیلی فون آیا کہ ''میرے پاس فلاں دن خالی ہے آپ اپنا قاعدہ لے کر یہاں آجایئے یا میں آپ کے ہاں آتا ہوں۔''

اور پھر مقررہ دن مقررہ وقت پر رالف رسل صاحب کاغذ، پنسل اور کاربن پیپر سے لیس لندن سے ستر میل کا سفر کر کے غریب خانے پر پہنچ گئے۔

میں نے پوچھا: ''کاغذ اور پنسل کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ کاربن پیپر کس لیے؟''

بولے: ''یہ اس لیے ہے کہ اگر کسی بات پر ہم میں اختلاف رائے ہو تو بحث و تمحیص کے بعد ہم جس نتیجے پر پہنچیں اسے لکھ لیں اور اس کی ایک کاربن کاپی بنالیں تاکہ ہم دونوں کے پاس تحریر کی نقل رہے۔ اس طرح بعد میں چیک کرنے میں آسانی ہوگی۔''

پھر انھوں نے میرے لکھنے کی میز کا جائزہ لیا جس کے ساتھ ایک کرسی تھی۔ کہنے لگے: ''اس کے ساتھ ایک اور کرسی لگا لیجیے۔''

میں نے کہا: ''کس لیے؟'' ''یہ اس لیے کہ ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر مسودہ پڑھیں گے، میز پر یہ کام بہتر ہوگا۔''

چنانچہ یہ کام ہوا، بہتر ہوا اور بخیر و خوبی تمام ہوا۔ جس جذبے اور لگن سے انھوں نے کام کیا، اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ کی جس طرح چھان پھٹک کی وہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس دوران ایک مرتبہ انھوں نے حروف تہجی کی بناوٹ اور لفظوں میں ان کی بدلی ہوئی صورتوں پر کچھ اس طرح باتیں کیں کہ میں نے دفعتاً سوچا ''اس شخص کی زبان کے بنیادی قواعد اور ان کی باریکیوں پر کتنی گہری نظر ہے۔ نجانے اپنی اردو پڑھائی کا آغاز اس نے کس قاعدے سے کیا ہوگا۔ (ظاہر ہے وہ میرا قاعدہ تو ہو نہیں سکتا!)'' میں نے رالف رسل سے پوچھا: ''آپ نے اردو کا کون سا قاعدہ پڑھا تھا؟''

وہ مسکرائے اور بولے: ''میں نے کوئی قاعدہ واعدہ نہیں پڑھا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، آپ کا یہ قاعدہ بے حد ضروری ہے۔''

''یہ قاعدہ بیحد ضروری ہے'' اور اردو نصاب کے لیے بنیادی کتاب لکھنا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔

چنانچہ رالف رسل اس مقصد کے لیے کاغذ، پنسل اور کاربن پیپر سنبھالے ستر میل سے بھی زیادہ لمبے لمبے سفر کرتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں، دوسروں سے لکھواتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے برطانیہ میں اردو کا یہ ''گنج گراں مایہ'' یونیورسٹی میں اپنے تدریسی فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے لیے کہیں زیادہ مصروفیات پیدا کرلے گا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کہ برطانیہ میں بسنے والے تمام مرد، عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے لگیں۔ میری دعا ہے خدا انھیں کم از کم اتنی عمر ضرور دے کہ وہ یہ کام اپنی زندگی میں مکمل کرسکیں!

□□□

فیروز مکرجی (لندن)

رالف رسل اور اردو

میں جب اس ملک میں آئی تو رالف رسل کے نام سے واقف تھی کیونکہ وہ ایک سال کے لیے اردو کی تعلیم حاصل کرنے ہندوستان گئے ہوئے تھے اور علی گڑھ میں رہ کر خورشید الاسلام کے ساتھ رہ کر اردو زبان کے علاوہ اردو ادب پر بھی وہیں کام کر رہے تھے۔ لندن آنے سے پہلے ہی میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سے منسلک تھی۔ اس زمانے میں انگلستان کی کمیونسٹ پارٹی بڑی منظم تھی۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے بڑے بڑے دانشور کمیونسٹ پارٹی سے منسلک ہی نہیں تھے بلکہ کل وقتی ممبر تھے۔ پارٹی مختلف ڈپارٹمنٹ میں بٹی ہوئی تھی جو انھیں صیغوں میں کام کرتے تھے۔ انٹرنیشنل ڈپارٹمنٹ ہم ہندوستانی طلبہ کی رہنمائی کرتا تھا۔ رالف رسل بھی انٹرنیشنل ڈپارٹمنٹ میں شامل تھے اور میری ملاقات ان سے کسی میٹنگ میں ہوئی تھی جو اب یاد نہیں۔ ان سے مل کر مجھے ان کی زندہ دلی اور پارٹی سے ان کی لگن دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ انھوں نے شروع ہی سے ہم سے کہا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ صاحب یا مسٹر لگانا پسند نہیں کرتے۔ ہم انھیں صرف رالف کہہ کر مخاطب کریں اور تقریباً پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ہمارا وہی رشتہ قائم ہے۔ پارٹی کے علاوہ رالف سے میرا رشتہ اردو کی وجہ سے بھی تھا اور گاہے گاہے ان سے ملتی رہتی تھی۔ اگر کوئی ضرورت ہوتی تو ان سے مشورہ کرتی۔

ہم لوگ اپنا وطن اپنا خاندان چھوڑ کر آئے تھے اس لیے ہمارے ہندوستانی گروپ کے سربراہ ادریس کوکس Idric Cox تھے۔ وہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ نہیں تھے بلکہ پارٹی کی طرف سے ٹریڈ یونین میں کام کرتے تھے اور ہماری رہنمائی کا کام بھی ان کے ذمے تھا۔ اس زمانے میں بائیں بازو کے طلبہ دو حلقوں میں تھے، وہ جو پارٹی کے ممبر تھے اور وہ جو sympathiyer کہے جاتے تھے۔ رالف کا رشتہ ہم سب سے تھا۔ ہم میں سے بہت سے طلبہ ہندوستان کے سفارت خانے میں کام کرتے تھے۔ ہماری سیاسی سرگرمیوں کا حال اس زمانے کے ہندوستان کے سفیر کرشنا مینن کو معلوم تھا لیکن انھوں نے ہمارے سیاسی خیالات کی وجہ سے کبھی ہمیں نوکری سے نہیں نکالا۔ اس زمانے کے حالات کا ذکر قرۃ العین حیدر نے اپنے شاہکار ناول ''آگ کا دریا'' میں بڑے ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ میں جرنلزم کی تعلیم اور تجربہ حاصل کرنے انگلینڈ آئی تھی لیکن میرے ہونے والے شوہر نشیتھ مکرجی نے رائے دی کہ میں جرنلزم کا کورس ختم کرنے کے بعد اردو میں پی. ایچ. ڈی. بھی کرلوں۔ رالف رسل شعبۂ اردو کے انچارج تھے لہٰذا میں نے ان سے رائے لی۔ انھوں نے کہا اگر چاہتی ہو تو ضرور کرلو۔ میں نے سوچا تھا کہ میں لکھنؤ سے اردو میں ایم. اے. کرکے آئی ہوں جلدی ہی پی. ایچ. ڈی. بھی کرلوں گی لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ بے حد سختی سے کام کرواتے تھے اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں پی. ایچ. ڈی. اور نوکری ایک ساتھ نہیں کرسکتی اس لیے میں نے نوکری چھوڑ دی۔ بی. بی. سی. سے جو تھوڑی بہت آمدنی ہوتی تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔ اب میں نے دل لگا کر پی. ایچ. ڈی. کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ رالف سے میں ہر ہفتے ملنے اور کام دکھانے جاتی تھی اور وہ مجھے رائے دیتے کہ میں کیا کروں۔ اس زمانے میں میں نے اردو اور انگریزی ادب اتنا پڑھا اور اس قدر لکھا کہ اس سے زیادہ کام کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسی زمانے میں شادی کے بعد میرا بچہ بھی ہوگیا۔ میرے شوہر بھی بیرسٹری پڑھ رہے تھے۔ ہم صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں کام کرسکتے تھے۔ ہمارے مالی حالات بہت خراب تھے۔ پھر بھی ہم دونوں اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ خدا خدا کرکے ہم دونوں نے اپنا کام ختم کیا۔ جب میں نے اپنا مقالہ لکھنا شروع کیا تو رالف نے میری اتنی مدد کی کہ میں ساری عمر ان کی مقروض رہوں گی۔ میرے علاوہ اور بھی طلبہ نے پی. ایچ. ڈی. کے لیے کام شروع کیا لیکن سوائے میرے اور ایک اور صاحب کے سب ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ میں اور میرے شوہر اپنی پڑھائی ختم کرکے ہندوستان چلے گئے لیکن مجھے وہاں اردو پڑھانے کی نوکری نہیں مل سکی۔ میرے شوہر کی پریکٹس چلنے میں اتنا وقت لگا کہ آخر ہم پھر واپس آگئے۔ یہاں آکر رالف سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسی گرم جوشی سے ملے اور اب بھی گاہے گاہے ان سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ میں اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے بہت کم کام کرسکتی ہوں لیکن وہ ماشاءاللہ 86 سال کی عمر میں بھی صحت مند ہیں اور لکھ رہے ہیں۔

اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ وہ یارکشائر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے قریب کے ایک اسکول میں ابتدائی تعلیم پائی۔ وہ بچپن سے ہی بے حد ذہین تھے اس لیے ایک پبلک اسکول میں ان کا داخلہ ہوگیا اور وظیفہ بھی ملنے لگا۔ اسی اسکول میں انھوں نے Latin اور کلاسیکی Greek پڑھنا شروع کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں کو پڑھنے اور سیکھنے میں ان کو بہت مزہ آیا لیکن سائنس اور ریاضی سے نہ انھیں دلچسپی تھی اور نہ انھیں پڑھنے اور سیکھنے کی کوشش کی۔ ریاضی اور سائنس کی طرح انھیں مذہب میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اسی زمانے میں انھیں مارکسیت سے ہمدردی ہوئی جو آہستہ آہستہ ان کی زندگی کا مرکز بن گئی جس پر اب بھی ان کا اعتقاد ہے۔

پبلک اسکول ختم کرنے کے بعد انھیں کیمبرج میں داخلہ مل گیا اور وہیں سے انھوں نے نہ صرف ڈگری حاصل کی بلکہ Communist پارٹی کے لیے لگ کر کام کیا۔ رالف انگریزی، فرانسیسی، اٹھنش، گریک، لیٹن اسکول کے زمانے سے ہی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فارسی زبان بھی سیکھی ہیں۔

میں جب اپنا مقالہ لکھ رہی تھی میں نے ایک بار ان سے کہا کہ آپ کا دماغ اور آپ کی یادداشت ایک اسپنج کی طرح ہے، جو ادب، زبان، سیاست کو فوراً جذب کرلیتی ہے۔ یہ میں نے ان کی خوشامد کرنے کے لیے نہیں کہا تھا کیونکہ ان کو خوشامد سے بڑی نفرت ہے وہ بھی مانتے ہیں کہ میں خوشامدی نہیں ہوں اور اگر ضرورت ہو تو صاف صاف بات کہہ دیتی ہوں۔

میرا خیال ہے رالف کا کیمونزم میں اعتقاد اور غریب ہندوستانیوں سے محبت ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ان کا اندازہ ان کی سوانح عمری پڑھ کر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے انھیں سمجھنے کے لیے ان کی سوانح عمری کا پڑھنا ضروری ہے۔ خاص کر وہ حصہ جب وہ دوسری جنگ عظیم میں ہندوستان میں تعینات تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انھوں نے انگریزوں کا برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ دیکھا اور اس کا اثر قبول کیا۔ میرا خیال ہے یہ اردو کی خوش نصیبی ہے کہ اسے رالف جیسا اسکالر حاصل ہوا۔

رالف رسل اپنی سوانح عمری کے شروع ہی میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشہور لوگوں کو ہی اپنی سوانح عمری لکھنا چاہیے لیکن میں مشہور نہیں ہوں سوائے ایک چھوٹے سے اردوداں طبقے کے۔ لیکن مجھے ان سے اختلاف رائے ہے۔ اردوداں طبقہ صرف ہندوستان اور پاکستان میں ہی محدود نہیں ہے وہ یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں پھیلا ہوا ہے۔ میں یہ اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کیونکہ اردو میری مادری زبان ہے بلکہ یہ دنیا کے کئی ممالک کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے اور اردو جاننے والی برادری وہاں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ جہاں اردو بولی اور پڑھائی جاتی ہے وہاں رالف رسل کا نام مشہور ہے۔ مجھ سے ایک لڑکی نے جو کینیڈا میں پڑھ رہی ہے اور غیر ملکی زبانوں میں اردو اس کے کورس کا حصہ ہے۔ اس نے کہا کہ مسٹر رالف کو پڑھے بغیر چارہ نہیں ہے کیونکہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھ کر ہی ہم اردو زبان اور اردو ادب سیکھتے ہیں۔ لیکن خودستائی رالف رسل کا شیوہ کبھی نہیں تھا۔ انھوں نے اردو ادب کے لیے جتنا کام کیا ہے اس کے لیے ہم سب ان کے شکرگزار ہیں لیکن میرا خیال ہے غالب پر ان کا کام سب سے اہم ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ غالب پر اتنا کام آپ کیوں کررہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا، غالب صرف ہندوستان اور اردو کے ہی اتنے بلند اور اہم شاعر نہیں ہیں وہ دنیا کے بلند ترین شاعروں میں شامل ہیں اور میں یونیسکو کے ذریعے ان کو ساری دنیا سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے غالب کے خطوط اور ان کے اشعار کا ترجمہ انگریزی میں کرکے وہی کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی اب محض انگریزوں کی ہی زبان نہیں ہے بلکہ وہ ساری دنیا میں رابطے کی زبان ہوگئی ہے۔ اس کام کے لیے ایک ایسے ترجمان کی ضرورت ہے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتا ہو۔ یہ رالف رسل کی خوش قسمتی تھی کہ خورشید الاسلام ان کے دوست اور شریک کار تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب پر ان کا کام سب سے اہم ہے لیکن سب سے پہلے انھوں نے اور خورشید الاسلام نے مل کر اردو کے تین مغل شاعروں پر کام کیا ہے جس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ مغلوں کے زمانے کی تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان اشخاص کے لیے جن کی زبان اردو نہیں بلکہ انگریزی ہے اردو کورس لکھے ہیں۔ ان کی ایک کتاب "In Persuit of Urdu" بھی قابل مطالعہ ہے۔ رالف رسل 1918 میں یارکشائر میں پیدا ہوئے اس حساب سے اب ان کی عمر 86 سال ہے۔ لیکن اس عمر میں جب عام طور پر ذہن وحافظہ اور جسم جواب دے دیتا ہے، ماشاء اللہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اب بھی جوان ہیں۔ ان کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنا لکھ چکے ہیں لیکن یہ سفر اب بھی جاری ہے۔

□□□

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم ورواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

ارجمند آرا

باتیں رالف رسل کی

8رجون 2004 کی صبح کوئی ساڑھے نو بجے لندن کے جنوب مغربی علاقے تھیمکر اسٹریٹ میں ڈرائیور نے ٹیکسی روکی اور میں نے 33 نمبر کی تلاش میں مکانوں پر نظر ڈالنی شروع ہی کی تھی کہ رالف رسل سڑک پار کر کے خود ہی ٹیکسی تک چلے آئے۔ روئی جیسے سفید گھنگرالے بالوں کے ساتھ سرخ وسپید مسکراتا ہوا چہرہ، آنکھوں پر چشمہ، پیروں میں سینڈل اور بغیر استری کی پینٹ؛ لیکن شرٹ کے نام پر جسم پر کچھ نہیں۔ایک لمحے کے لیے مجھے جھٹکا سا لگا کہ کسی خاتون مہمان سے ملنے کا یہ کوئی معقول طریقہ نہیں ہے۔ کلچر کے تصور سے متعلق انگریزوں کے جو قصے سنے تھے، رالف کا رویہ ان سے تو قطعی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔لیکن اگلے ہی لمحے خیال آیا کہ رالف سے کسی قسم کے تکلف اور چونچلوں کی توقع کرنا بڑی 'انگریزی' بات ہوگی۔ان کے بارے میں کافی کچھ تو میں ان کی خودنوشت Findings Keepings (جوئندہ یابندہ) کا ترجمہ کرتے ہوئے ہی جان گئی تھی۔ ہم نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور رالف نے میری 'سفر پُرسی' کی (بعد میں ہر روز صبح اٹھ کر وہ میری 'خواب پرسی' کرتے تھے، یعنی پوچھتے تھے کہ کیا تمھیں نیند اچھی طرح سے آئی؟)۔ اس دوران ڈرائیور نے میرا سوٹ کیس مکان کے دروازے پر رکھ دیا، اور اس کو کرایہ ادا کر کے ہم گھر میں داخل ہو گئے۔اس مکان میں مجھے اگلے ایک ماہ تک قیام کرنا تھا۔میں رالف کی دعوت پر گرمیوں کی چھٹیوں میں لندن آئی تھی تاکہ ان کی خودنوشت کے ترجمے کو آخری شکل دی جاسکے جو میں نے دہلی یونی ورسٹی کی گذشتہ برس کی موسمِ گرما کی تعطیلات میں مکمل کیا تھا اور اس دوران خالی وقت میں گاہے بہ گاہے اس پر نظرِ ثانی کر کے ایک بار پروف ریڈنگ کا کام بھی پورا کر چکی تھی۔ رالف کی تجویز تھی کہ کتاب کو اشاعت کے لیے دینے سے پہلے ہم دونوں مل کر بیٹھیں اور اس کا مطالعہ کر ڈالیں تاکہ اردو کے قارئین کی ضروریات کے مطابق ضروری وضاحتیں شاملِ کتاب کی جاسکیں اور جہاں جہاں انگریزی متن کو سمجھنے میں یا اس کا صحیح اردو ترجمہ کرنے میں دشواری یا غلطی ہوئی ہو وہاں متن کو واضح اور درست کیا جاسکے۔

درمیانی سائز کے رالف کے فلیٹ کا صدر دروازہ انگریزی حرف P کی شکل والی بیٹھک کی دُم کی طرف واقع ہے۔ دروازے سے داخل ہو کر آپ دو تین قدم کی مختصر راہداری قطع کر کے بیٹھک میں پہنچ جاتے ہیں جو مطالعے کا کمرہ بھی ہے۔ داخل ہوتے ہی داہنے ہاتھ پر ڈائننگ ٹیبل ہے جو مطالعے کی میز کا بھی کام دیتی ہے۔ یہ بیٹھک کی چوڑائی تک تمام جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ اسی سرے پر باورچی خانے کا دروازہ ہے اور اس کے ساتھ لگا ہوا نیلے رنگ کا مخملی صوفہ جو کمرے کی لمبائی میں دیوار کے سہارے سجایا گیا ہے۔صوفے کے سامنے میز کی دوسری جانب رالف کی جھولنے والی کرسی پڑی رہتی ہے اور اس کے قریب ہی لکڑی کے ایک میز نما چھوٹے سے اسٹینڈ پر ٹیلی فون رکھا رہتا ہے۔ P کے سر کی جانب بائیں ہاتھ کا سرا ایک گہرے کھانچے کی صورت میں ہے جو چوڑائی میں بیٹھک کے تقریباً ایک تہائی حصے کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس طرح بیٹھک مستطیل نہ ہو کر چھے گوشوں والی ہے۔ دیوار کے صوفے والے حصے کو چھوڑ کر پوری بیٹھک میں دیوار دوز شیلف چھت تک لگے ہوئے ہیں جن میں رالف کی کتابیں موضوعاتی ترتیب سے لگی ہوئی ہیں۔ مثلاً آپ دیکھیں گے کہ دوسری جنگِ عظیم سے متعلق سیاسی اور تاریخی کتابیں ایک ہی جگہ ترتیب سے رکھی ہیں۔ یہیں ہٹلر، فاشزم، فرانس اور جنگِ عظیم وغیرہ سے متعلق کتابیں، اسٹالن کے دور کے یو ایس ایس آر، کمیونزم، کمیونسٹ نظریات کے مختلف دبستانوں اور تاریخ کی اہم کتابیں، اور اسی دور کے مختلف نظریات اور مباحث کی کتابیں ترتیب سے لگی ہوئی ہیں۔ ایک جانب روسی ادب کے انگریزی تراجم ہیں۔اس کے علاوہ اطالوی اور لاطینی زبان کی کتابیں بھی ہیں۔ برِ صغیر کی تہذیب وثقافت اور تاریخ پر، خصوصاً ہندستان اور پاکستان کے مسلمانوں پر بہت سی کتابیں رالف کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں۔ پھر انگریزی کے کلاسیکی ادب اور معاصر ادب کا شیلف ہے۔ انگریزی میں لکھنے والے ہندستانی پاکستانی تخلیق کاروں کی بہت سی کتابیں بھی سلیقے سے لگی ہوئی ہیں۔ انگریزی، اردو، ہندی وغیرہ کے بہت سے لغات، انسائیکلوپیڈیا اور تھیسارس؛ سیاحت سے متعلق کتابیں اور لاتعداد نقشے، موسیقی اور آرٹ پر کتابیں، لوک گیتوں اور مہمل تک بندیوں کی کتابیں— غرض کتابوں کی ایک متنوع دنیا اس بیٹھک میں آباد ہے۔ بیٹھک کی لمبائی میں آخری سرے پر ایک دروازہ ہے جو ایک چھوٹی سی راہداری میں کھلتا ہے۔اس میں بالکل سامنے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، داہنے ہاتھ پر خوابگاہ اور دوسری جانب یعنی بائیں جانب غسل خانہ ہے۔

سامنے کے چھوٹے کمرے میں کمپیوٹر اور تین دیواروں پر کتابوں کے ویسے ہی شلیف ہیں جیسے بیٹھک میں ہیں، یعنی ان کی اونچائی بھی چھت تک پہنچتی ہے۔ان میں سے ایک شیلف میں اردو ادب کی کتابیں ہیں۔ خوابگاہ اور راہداری میں بھی یہی اہتمام ہے۔ البتہ خوابگاہ کے اور چھوٹے کمرے کے دو شیلفوں میں لوگوں سے خط وکتابت کی فائلیں اور باکس ترتیب سے لگے ہیں۔ خوابگاہ میں بیڈ کے نیچے بھی فائل سائز کے پلاسٹک کے چوڑے بکسوں میں

"ارے، تم نے یہ کیا کیا جی!" کولی بے ہوش ہو گئی۔

کچھ دیر میں کولی کی بے ہوشی تو ختم ہو گئی، لیکن اس کے دل کو جو صدمہ پہنچا تھا، اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ "رہے۔ یہیں سب کچھ!" کہہ کر کولی نے پیتل کے گھڑے سے صرف چار سو روپے نکالے، سونے کی چٹی اور چاندی کا کمر بند لیا اور پلّو میں باندھ کر دھبدھمی[4] میں اپنی بڑی بہن پھولی کے گھر چلی گئی، بولی، جدھر آنکھ اٹھے گی، اُدھر چلی جاؤں گی، بیٹا آ کر بندوبست کر دے۔ اب اس مردہ کھوکے کا منہ نہیں دیکھوں گی!"

پھولی نے کہا، ڈھائی کوڑی[5] تیری عمر ہوئی۔ بول، اس عمر میں کہاں جائے گی۔ یہیں رہ۔ تیرے ہاتھ میں روپے پیسے تو ہیں ہی، پھر فکر کیا ہے؟"

کولی نے کہا، "ایسا نمک حرام ہونا چاہیے کسی کو؟ ارے آنکھ کے اندھے! تم نے دیکھا نہیں؟ لالٹین لے کر میں کھڑی رہتی تھی رات کو کہ تم بہنوئی کے گھر سے آ گے، پوری کی پوری سوزنی بچھا کر تمھیں سونا پسند ہے۔ کپڑا پھٹتے ہی میں دوسرا تیار کر دیتی تھی۔ چبوترے کی لپائی پتائی کرتی تھی، صحن میں ساگ سبزی اور مرچیں اُگاتی تھی۔ بنا مرچ کے تو تمھارا نوالہ نہیں اٹھتا! پچھلی بار میڈیکل[6] میں بھیج کر تمھارے لیے نیا چشمہ خرید وادیا، وہ تم ٹرین میں گم کر آئے۔ پھر اس بار خرید وادیتی۔ آخر کس لیے طلاق دی مجھے تم نے؟ چھوٹے بچے کو کیا کھانسی نہیں ہوتی، کیا بخار نہیں آتا؟ بیتائی ڈاکٹر کے علاج سے پچھلی بار کیا ٹائیفائڈ ختم نہیں ہوا؟ پھر اس کے علاج سے کیا بچے کی بیماری دور نہ ہوتی؟"

"اب وہ سب مت سوچ" کہہ کر پھولی وہاں سے اٹھی اور جا کر اپنا کام کرنے لگی۔ اس کے دل کو بے حد خوشی حاصل ہوئی تھی۔ پھولی کی دو سوتنیں ہیں، جن کے ساتھ اسے گزارا کرنا پڑتا ہے۔ شوہر سے آئے دن اس کا جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ کولی کی خوش حال شادی شدہ زندگی سے اسے حسد ہوتا رہا ہے، اب جو کولی کی قسمت پھوٹ گئی ہے تو خوشی سے سرشار پھولی نے جا کر اپنے چھوٹے بیٹے سے کہا، جا، ندی میں چھیپ ڈال، مچھلی پکڑ لا، وہ بنا مچھلی کے کھانا نہیں کھاتی، دیکھ، اس کے پاس ہی رہنا اور موقع دیکھ کر کہنا۔ خالہ! ایک چھتری خرید دو نا۔"

بڑی بہن کے یہاں رہتے ہوئے ہی کولی کو خبر ملی کہ ارشد کا وہی چچیرا بھائی آ کر اس کے گھر میں رہ رہا ہے اور اب دونوں میں خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔ روزانہ ہی مرغی پکائی جا رہی ہے، کولی کا بیٹا ابھی چھٹی لے کر آیا نہیں ہے۔

پھولی نے کہا، "کتنا اچھا تھا، تیرا گھر! اب اس کے مزے دوسرے لوٹ رہے ہیں۔ تجھ سے ضرور انجانے میں کوئی گناہ ہوا ہوگا، نہیں تو اللہ تجھے ایسی سزا دیتا ہی کیوں؟"

پھولی کو دس باتیں سنا کر کولی چھوٹی بہن دولی کے گھر چلی گئی۔ بہن بہنوئی نے کہا، "ہمیشہ کے لیے یہیں کیوں نہیں رہ جاتیں؟ تم ہی کہو، ہاتھ میں روپے پیسے رہتے ہوئے پریشانی کی بات کیا ہے؟ مرغی بطخ وغیرہ خرید و اور پھر اپنا گھر بسا لو۔"

"گھر بار پر تھوک چکی ہوں، اب پلٹ کر اسی کو چاٹوں؟" کہہ کر کولی گم صم بیٹھی رہی، سینے میں جیسے آلوچے کی لکڑی کے انگارے دہک رہے تھے! تنکا تنکا جوڑ کر بنائے ہوئے آشیانے کو چھوڑ کر کولی کیا پھر وہی سب کر سکتی ہے؟ کیا وہ سیاہ پڑ جانے والے دھان اُبال کر بطخوں کو کھلا سکتی ہے؟ شام ہوتے ہی کیا وہ نئے سرے سے تی تی، تی تی کہہ کر مرغیوں کو واپس گھر میں بلا سکتی ہے؟

بیٹے نے آ کر کہا، "جانتا ہوں کہ سب کچھ برباد ہو گیا، پھر بھی تم وہیں چلو ماں!"

"کیا غیر مرد کے ساتھ رہنے جاؤں؟ تیرا باپ اب میرے لیے غیر مرد ہے نا؟"

"بابا کہتا ہے....."

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے، جو ہوا سو ہوا۔ اس کا حل نکل سکتا ہے، وہ الگ....."

"کیا؟"

"بابا کچھ کھاتا پیتا نہیں ہے۔ دن رات روتا رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ میں نے کیا کیا!"

کولی کے دل کو ایک عجیب و غریب طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ "اور کیا کہتا ہے؟"

"جس کے لیے جیتا رہا ہوں، اسی کو طلاق دے دی! بہو کے نانا کہتے ہیں کہ اس کا حل ہے۔"

"کیا حل؟"

بیٹا سر جھکا کر اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگا۔ اس نے کہا، "یہ سب وہی لوگ بتائیں گے۔"

وہ سب لوگ دولی کے گھر آئے، کولی کے روپے سے چائے، بسکٹ اور پان خرید کر ان کی خاطر داری کی گئی، بہو کے نانا عمر رسیدہ، تعلیم یافتہ اور پرائمری اسکول کے ٹیچر ہیں، سب ان کی عزت کرتے ہیں۔

کولی گھر کے اندر ہی سے سب کچھ سننے لگی، کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بہو کے نانا نے کہا۔

"ہارا، کیا تیری ماں گھر بسانا چاہتی ہے؟"

ہارا نے جواب دیا،" ضرور"

" تب مشکل کیا ہے؟ صرف چند کوڑی روپیوں کا معاملہ ہے۔"

پنچ نے رائے دی کہ کلثوم پھر سے نکاح کر لے، گاؤں کا عرفان منڈل راضی ہے، دو چار راتیں ایک ساتھ گزار کر عرفان کولی کو طلاق دے دے گا، اور تب ارشد شادی کر کے اسے اپنے گھر لے جائے گا۔

کولی یہ سب سنتے ہی چھی چھی کرنے لگی، پینتیس برس کی شادی شدہ زندگی میں کولی نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر کسی غیر مرد کی طرف نہیں دیکھا، اس نے اپنے بہنوئیوں کو بھی کھانے دیے ہیں تو اپنے بیٹے کی موجودگی میں دیے ہیں۔ آج اس عمر میں ستائیس برس کے بیٹے کے سامنے وہ ایسا کام کرے گی؟

" نہیں کرے گی تو جا، مر! کہہ کر غصے میں پنچ نے اپنی راہ لی۔ دوسرے دن ارشد روتا ہوا آیا،" اس سے کہہ دے، دولی اگر اس طرح نہ کیا جائے تو گناہ ہوگا، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو بھلا ہم اس کے لیے تیار ہوتے؟"

" بابا، وہ پنچ کی بات سننے کو ذرا بھی تیار نہیں ہے۔"

" کہہ دے، میں خودکشی کرلوں گا، فولیڈل(7) کھالوں گا!"

کولی نے گھر کے اندر ہی سے اونچی آواز میں کہا،" دولی جا کر کہہ دے، جو آدمی مجھے سودا سلف تک لانے نہیں دیتا تھا، جس نے کبھی سڑک پر نکلنے تک نہیں دیا۔ وہی آدمی آج مجھ سے ایسی بات کس طرح کر رہا ہے؟"

ارشد جس طرح روتا ہوا آیا تھا اسی طرح روتا ہوا چلا گیا۔

چند دنوں کے بعد خبر آئی کہ ارشد سب کچھ اونے پونے بیچ کر فقیر ہو رہا ہے۔ بیلے، مرغی، گھر دروازہ، سب کچھ، نیتائی ڈاکٹر نے پان سو روپے میں خرید لیا ہے۔

کولی دن بھر بالکل خاموش رہی، اس کے بعد بولی،" ہاتھ کا زیور، چاندی کا کمربند، بچھوا، سب چھوڑ کر آئی تھی، دولی! بجنا کے پیڑ کے نیچے گاڑ کر چلی آئی تھی، جاؤں لے آؤں۔"

" پھر وہاں تم رہنے جاؤ گی!"

" جاؤں گی اور الٹے پاؤں پھروں گی، نیتائی ڈاکٹر کے گھر میں کوئی مجھے جانے کیوں دے گا؟"

دولی اور اس کے میاں نے ایک دوسرے سے آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا اور دل ہی دل میں ہنسنے لگے۔ اب ان لوگوں کا اپنا سب کچھ نہ سہی، تھوڑا بہت تو ہوگا؟

" اکیلی جاؤ گی؟"

" بوڑھی ہوگئی ہوں، ڈر کیا ہے؟"

آدھی رات کو پانچ میل چل کر کولی اپنے گھر پہنچی، چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جگہ سنسان سی ہوگئی تھی، ارشد دری بچھا کر لیٹا ہوا تھا، اس کے قریب پہنچ کر کولی نے پاؤں پٹکا۔

" آگئی بی بی؟"

" مرمردہ کھوکے! میں تیری بی بی کیسے ہوئی رے؟ میں سب روپے پیسے اور گہنے پاتے، اپنے پلو میں چھپا کر لے آئی ہوں۔ دولی سے بہانہ کر کے آنا پڑا ہے۔ چلو، رات کی رات دونوں نکل چلیں۔"

" کس طرح اور کہاں؟"

" ریل گاڑی پر سوار ہو کر، ہم پچھلی بار سب دیکھ نہیں آئے تھے؟ کلکتہ جائیں گے، بیک بگان میں گھر لے کر رہیں گے۔ ایک طرف تم رہوگے، دوسری طرف میں رہوں گی۔ یا میں کام کروں گی یا تم بیڑی بناؤ گے۔ میں تمھارے لیے چاول اُبال دوں گی، تم چولھے پر سے اتار لینا اس طرح کوئی گناہ نہیں ہوگا۔"

" ایک گھر میں....."

" مجھے جو ڈھکیل رہے تھے دے کے مریض عرفان کے گھر میں؟ یہ اس سے اچھا نہیں ہے؟"

" ہارا کیا کہے گا؟"

" اس کی سمجھ میں جو آئے گا، کہے گا، کہوں گی، ہم میاں بیوی کی طرح نہیں رہتے ہیں بابا۔ ایک ساتھ رہتے رہتے بوڑھی ہوگئی ہوں۔ اسی طرح رہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اب ایک ساتھ رہنے میں گناہ ہے، تو گناہ ہی سہی!"

" لوگ جان گئے تو؟"

" جو جی میں آئے گا، کہیں گے، چلو، اٹھو۔"

رات رہتے ہی وہ دونوں ریلوے اسٹیشن کی طرف چوروں کی طرح چھپ چھپا کر چل پڑے، کولی نے ذرا بھی پروا نہیں کی کہ پورے گاؤں میں بدنامی ہو جائے گی اور لوگ تھو تھو کریں گے۔ ارشد نے کہا،" مجھے تو دکھائی نہیں دیتا، تو ہاتھ پکڑ لے۔"

" اپنی لاٹھی بڑھاؤ، پکڑ لیتی ہوں۔ اب تمھارا ہاتھ کیسے پکڑ سکتی ہوں؟ سنبھل سنبھل کر قدم بڑھاؤ، ورنہ پگڈنڈی پر ٹھوکر کھاؤ گے!"

□□□

پتہ:
10, Hem Ghosh Lane,
Shibpur, Howrah-711102

محمود ہاشمی (برمنگھم)

رالف رسل

رالف رسل کا نام میں نے آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے سنا تھا، ایک محفل میں ایک صاحب نے باتوں باتوں میں کہا: ''یار! ایک انگریز ہے لیکن اردو بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے پیٹ سے سیکھ کر آیا ہے۔'' محفل میں ایک کشمیری صاحب بیٹھے تھے انھوں نے کہا: ''یار! کوئی کشمیری پنڈت ہوگا۔ گورا رنگ دیکھ کر تم نے اسے انگریز سمجھ لیا۔'' وہ صاحب بولے: ''بھئی! کشمیری پنڈت ہوتا تو نام ہی سے پتا چل جاتا۔ رالف رسل نام تھا۔ کیا یہ نام کسی کشمیری پنڈت کا ہوسکتا ہے۔''

لیکن ہمارے کشمیری دوست ہر بات جھٹلانے اور کسی کی ہرگز ہرگز نہ ماننے کے موڈ میں تھے۔ فوراً بولے: ''اچھا، تو تم رحمت رسول کی بات کر رہے ہو۔ بھئی! وہ واقعی کشمیری پنڈت ہے۔ سوری، آئی ایم ویری ویری سوری، اصل میں اس کا خاندان اور ڈاکٹر اقبال کا خاندان کشمیر کی وادی سے ایک ساتھ نکلے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کے بڑے بزرگ نے جونہی سرحد پار کی اور پنجاب کے شہر سیالکوٹ پہنچے تو وہیں ٹک گئے، لیکن رحمت رسول کے باوا نے دلی جاکر دم لیا۔ یہ رحمت رسول دلی کی پیداوار ہے، پر ہے بڑا مسخرہ۔ بالکل انگریز لگتا ہے، اور یار لوگ دوسروں کو بیوقوف بنانے کے لیے اسے لیے لیے پھرتے ہیں۔ انگریز کہہ کر تعارف کراتے ہیں اور اس کا نام رالف رسل بتاتے ہیں۔''

ان صاحب نے جنھوں نے یہ ذکر شروع کیا تھا کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ لیکن محفل پر ہنسی کا ایک ایسا دورہ پڑ چکا تھا کہ اس نقار خانے میں ان کی آواز طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔ اور بات آئی گئی ہوگئی۔

کچھ دن بعد پھر اسی محفل میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہ صاحب جنھوں نے رالف رسل کو رحمت رسول بتا کر اور اس کا شجرۂ نسب کشمیر کی وادی سے دریافت کرکے دلی سے جوڑا تھا ذرا سنجیدگی کے موڈ میں تھے، اور باتیں رالف رسل کی ہورہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے:

''یار! جب میں یہ سنتا ہوں کہ ایک انگریز رالف رسل اردو بولتا ہے اور صحیح بولتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے لیکن جب لوگ اس کی اس خوبی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی معجزہ ظہور میں آگیا ہو تو جی چاہتا ہے اپنا سر پیٹ لوں یا کہنے والے کا سر پھوڑ دوں، میں بھی رالف رسل کی عظمت کا معترف ہوں لیکن میں اس سے محض اس لیے متاثر نہیں ہوتا کہ وہ اردو صحیح بولتا ہے۔ آخر ہم میں سے بھی بہت سے اس کی مادری زبان انگریزی بولتے ہیں اور اکثر صحیح بولتے ہیں، بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ ہاں، میں اس انگریز کا معترف ہوں، تو اس لیے کہ اس نے اس اردو کو اپنایا ہے جسے اپنے گھر میں بھی وہ عزت اور احترام نہیں ملتا جو اس کا حق ہے۔ ہمارے لیے اردو سے زیادہ انگریزی 'محترم' ہے۔ ہم انگریزی زبان میں قابلیت بڑھانے کو ترقی کی معراج سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کو جو اردو کے متوالے ہیں کمتر قسم کی مخلوق سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اردو کروڑوں عوام کی زبان ضرور ہے لیکن ہمارے خواص اس سے بدکتے ہیں۔ وہ لوگ جو اردو میں ادب تخلیق کرتے ہیں اور شعروشاعری کو اپنا شعار بناتے ہیں انھیں بھی ہمارے خواص برداشت ہی کرتے ہیں، کچھ اپنی وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اور بعض بعض تفریح طبع اور دل بہلاوے کی خاطر.....''

میرا دوست بہت سنجیدہ ہو رہا تھا اس نے کہا: ''رالف رسل ہمارے لیے اہم ہے، بہت اہم ہے، ہمیں اپنی زبان کو اپنے ہاں کے خواص میں قابل قبول بنانے کے لیے اس جیسے خاص الخاص انگریز کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کا وجود ہمیں احساس دلاتا ہے کہ دیکھو تم خواہ مخواہ احساس کمتری میں مارے جا رہے ہو۔ مجھے دیکھو اگر تمھاری یہ اردو اتنی ہی گئی گزری ہوتی تو مجھے کیا پڑی تھی کہ اپنے منہ کا ذائقہ خراب کرتا اور اس سے محبت کی جوت جگاتا۔'' میں سمجھتا ہوں میرے اس کشمیری دوست نے غلط نہیں کہا تھا۔

یہ درست ہے کہ رالف رسل کے علاوہ اور بھی بہت سے انگریزوں نے اردو کو قابل توجہ سمجھا۔ بلکہ بعض نے تو اردو میں شاعری تک کی اور حقہ پی پی کر شعر کہے لیکن یہ عام طور پر اس زمانے کی باتیں ہیں جب انگریز اور اس کی انگریزی نے ابھی ہمیں اپنے دام میں گرفتار نہیں کیا تھا۔ ہمارا تشخص برقرار تھا۔ اور ہمیں اس پر ناز بھی تھا۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں تازہ وارد تھی اور ایک نئے ملک کے لوگوں کو سمجھنے اور ان میں مقبول ہونے کے لیے انگریز اس طرح کا ہر اقدام کر رہا تھا جو اس کو مفید مطلب معلوم ہوتا تھا۔ ملک کا مکمل طور پر حاکم بن جانے کے بعد محبتوں کا یہ زمانہ بہت حد تک ختم ہوگیا۔ اب ہماری باری تھی اور ہم پر یہ اثر ہونے لگا تھا کہ انگریزی کو اپنائیں۔ تاہم اب بھی

حکمراں طبقے کے کچھ لوگ اردو میں دلچسپی لینے پر مجبور تھے۔ ان میں عام طور پر وہ پادری تھے جو''نیٹوز'' میں مذہبی پرچار کرنے کے لیے اردو سیکھتے تھے۔ انھیں زبان کے لطیف پہلوؤں سے کوئی غرض نہ تھی اور وہ ایک'' کام چلاؤ'' قسم کی اردو سے مطمئن تھے۔ پادریوں کے علاوہ ایک اور قابل ذکر طبقہ جو اردو سیکھتا تھا اور اسے''ہندوستانی'' کہتا تھا، برطانوی افسران اور ان کی میم صاحبائیں تھیں۔ جو اپنے نوکروں، خانساموں اور مالیوں وغیرہ پر حکم چلانے کے لیے یہ''دردسر'' مول لیتی تھیں۔ ان کا مبلغ علم عام طور پر اس طرح کے چند جملوں تک محدود ہوتا تھا کہ''کتنا بجا ہے'' اور'' آل وی سب چیز ہے''زبان کے صحیح تلفظ، لب ولہجہ اور اس کے دوسرے لوازمات کی طرف توجہ دینے کی نہ ان میں سے کسی کو ضرورت تھی اور نہ وہ اس کے لیے محنت کرنے کے لیے تیار تھے۔ بہرحال کچھ انگریز ایسے بھی تھے اور اب بھی ہیں جنھوں نے اردو کے ساتھ اگر اپنا تعلق قائم کیا تو اسے ایک اہم زبان سمجھ کر، اور نہایت خلوص کے ساتھ۔ انھوں نے رالف رسل کی طرح اردو قواعد وضوابط بھی سیکھے۔ اس کا مزاج بھی اپنایا اور اس سے تہذیبی رشتے بھی جوڑے۔ لیکن ان کی تعداد کم۔ بہت کم تھی، اور انھیں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔

اب البتہ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اس کی خاصی بڑی وجہ رالف رسل ہیں۔ انگریزوں کی اردوداں برادری جو رالف رسل کے بعد پیدا ہوئی ہے اور ہورہی ہے وہ کسی نہ کسی طرح رالف رسل ہی کا پرتو ہے۔ اس ایک چراغ سے کئی نئے چراغ جلے ہیں اور اس سلسلے میں زندہ وتابندہ رالف رسل اور ان کی''گل افشانی گفتار'' کا بہت بڑا دخل ہے۔

رالف رسل صاحب سے میری پہلی ملاقات ان دنوں ہوئی جب میں برطانیہ میں نووارد تھا اور یہاں کی دوسری''قابل دید'' چیزوں کے ساتھ ساتھ ان سے ملنا اور انھیں دیکھنا ضروری کاموں میں سے ایک تھا۔ چنانچہ میں نے یہ ضروری کام کیا اور اس رالف رسل کو دیکھا جو برطانیہ کی اس انگریز دنیا میں اردو کا چراغ جلائے بیٹھا تھا۔ اس کے بعد چلتے چلاتے کی دو چار اور ملاقاتیں بھی ہوئیں جن میں ایک مجھے خاص طور پر یاد ہے۔

ہم دونوں کو اوپر کی ایک منزل سے نیچے اترنا تھا اور ہم جلدی میں تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ بٹن دبانے کے بعد کچھ دیر''لفٹ'' کا انتظار کرنا پڑتا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ جونہی ہم نے بٹن دبایا، لفٹ سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس پر رالف رسل صاحب نے ایک نعرہ لگایا''زندہ باد!''

میں نے چونک کر انھیں دیکھا اور دل میں سوچا یہ شخص صرف اردو بولتا ہی نہیں اردو کے ساتھ رہتا بھی جاتا ہے۔ لیکن ان کے اصل جوہر مجھ پر پچھلے پانچ سال میں کھلے، جب مجھے انھیں ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ صرف اردو بولتے ہی نہیں اور خود اردو پڑھ لکھ کر لندن یونیورسٹی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں صرف اردو پڑھانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ انھوں نے یہ بیڑا بھی اٹھا رکھا ہے کہ سارے برطانیہ کو اردو داں بنالیں گے۔ اس سلسلے میں لندن سے لے کر گلاسگو تک کا قریب قریب ہر شہر ان کی زد میں ہے۔ اس شہر میں ایشیائی بچوں کو اردو پڑھانے جارہے ہیں تو اس شہر میں بالغوں کے لیے اردو پڑھانے کا کورس جاری کررکھا ہے۔ آج ایک شہر میں وہاں کے کسی اسکول کے ہیڈ ٹیچر کو اس بات پر آمادہ کررہے ہیں کہ وہ اپنے اسکول میں اردو کو باقاعدہ نصاب میں شامل کرلے تو کل کسی اور شہر میں وہاں کے ایجوکیشن آفیسر، انسپکٹر یا ایڈوائزر کو برطانوی اسکولوں میں اردو پڑھانے کی اہمیت کا قائل کررہے ہیں اور یہ رالف رسل صاحب کی بھاگ دوڑ ہی کا نتیجہ تھا کہ لندن میں ایک اردو کانفرنس ہوئی اور پھر دوسرے سال بڑے دھڑلے سے ایک اور ہوئی۔ ان کانفرنسوں میں ملک کے ارباب اقتدار اور محکمہ تعلیم کے بااثر نمائندوں کو خاص طور پر شریک کیا گیا تاکہ برطانوی ذہنوں پر اردو کے بارے میں کم علمی کے جو غلاف چڑھے ہیں وہ اتر جائیں اور وہ بھی اپنے ہاں کے اسکولوں میں اردو کو ایک باقاعدہ مضمون کی حیثیت دینے کے بارے میں سوچیں اور عملی قدم اٹھائیں۔

ایک صاحب سے جو یہاں کے اسکولوں میں پنجابی زبان کو نصاب میں شامل کرنے کے بارے میں بڑے مستعد ہیں، ایک کانفرنس میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے:''برطانیہ کے ایشیائیوں میں سب سے زیادہ پنجابی بولنے والے ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں کے اسکولوں میں پنجابی کو اردو سے پہلے اس کا جائز مقام ملنا چاہیے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تم لوگ بڑے خوش قسمت ہو کہ تمھیں رالف رسل مل گیا ہے ورنہ تم اردو والے تو ان شاء اللہ، ماشاء اللہ والے ہو۔ ہر کام اللہ کرکے خود کچھ نہیں کرتے۔ اگر یہ رالف رسل نہ ہوتا تو بس مشاعرے ہی کرتے رہتے اور ہم تمھارے بچوں کو بھی گورمکھی رسم الخط میں پنجابی پڑھادیتے۔''

مانچسٹر میں ایک انجمن ہے جس کا نام ہے''نیشنل ورکنگ پارٹی اون سمر لیز فار اردو ٹیچنگ'' اس کے معتمد وہاں کے کرس لیو کی صاحب ہیں لیکن روح رواں ہمارے رالف رسل ہی ہیں۔ یہ انجمن اس لیے قائم کی گئی ہے کہ

فیضان عارف

رالف رسل سے انٹرویو

ڈاکٹر رالف رسل ایک طویل مدت تک اردو زبان کی درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل وہ تصنیف اور تحقیق کے کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ پہلے انگریز ہیں جنھوں نے اردو زبان سیکھ کر برطانیہ میں نہ صرف اس کے فروغ کے لیے کام کیا بلکہ اردو کی کلاسیکی شاعری کے حوالے سے بھی گراں قدر تحقیقی خدمات انجام دیں۔ گذشتہ دنوں ہم نے ان سے ایک ملاقات میں اردو زبان کو محور بنا کر جو گفتگو کی وہ قارئین کی نذر کی جارہی ہے۔

- آپ کو اردو زبان سے دلچسپی کب پیدا ہوئی اور اس دلچسپی کے محرکات کیا تھے؟
- اردو سے میری دلچسپی اتفاق کی بات تھی، دراصل جب دوسری عالمی جنگ کے موقع پر فوج میں جبری بھرتی ہونے لگی تو مجھے بھی فوج میں جانا پڑا جس کے بعد مارچ 1942 میں مجھے ہندوستان بھیجا گیا۔ اس وقت انڈین آرمی کی زبان اردو تھی۔ مجھے سپاہیوں سے بات چیت کرنے کے لیے اردو بولنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ چنانچہ میں نے اردو زبان سیکھنا شروع کی تو اس سے میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ ہندوستان جانے سے پہلے میں کمیونسٹ تھا اور ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کو جائز سمجھتا تھا اس لیے بھی میں اردو سیکھنے کا خواہش مند تھا۔ میں تقریباً ساڑھے تین سال ہندوستان رہا۔ اس دوران میں روانی سے اردو بولنا سیکھ گیا اور اردو ادب سے بھی مجھے آشنائی ہوگئی۔ برطانیہ واپس آنے کے بعد جب مجھے فوجی ملازمت سے رہائی ملی تو مجھے پوری توجہ اور دھیان سے اردو کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا کیونکہ اس وقت مجھے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی طرف سے اردو پڑھنے کے لیے وظیفہ دیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے وظیفہ ملنے کے بعد اردو میں بی.اے. آرنز کیا، سنسکرت میرا ضمنی مضمون تھا۔ 1949 میں مجھے (SOAS) اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں اردو کا لیکچرر بنادیا گیا جس کے بعد میں ایک سال کے لیے ہندوستان گیا اور علیگڑھ یونیورسٹی کے علاوہ دیگر تعلیمی اداروں سے استفادہ کرکے برطانیہ آیا اور 1981 تک (SOAS) میں اردو پڑھانے کے بعد اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں، بلکہ کل وقتی لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول ہوں۔
- آپ نے اردو زبان سیکھنے کے لیے کیا لائحۂ عمل اختیار کیا؟
- جب میں ہندوستان میں تھا تو اس وقت انڈین فوج میں کچھ لوگ ایسے ہوتے تھے جن کو منشی کہا جاتا تھا، یہ وہ ہندوستانی ہوتے تھے جو انگریز افسروں کو اردو سکھاتے تھے تاکہ وہ سپاہیوں سے اردو میں بات چیت کرسکیں۔ میں نے بھی اردو کی ابتدائی بول چال انھی منشیوں سے سیکھی اور مجھے اردو سیکھنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی زبان سیکھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس زبان کو زیادہ سے زیادہ بولنے کی کوشش کی جائے اور اس ملک یا ماحول میں جاکر رہا جائے جس کی زبان آپ سیکھنا چاہتے ہیں۔ جب آپ کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے مجبوراً دوسری زبان بولنا پڑے گی تو آپ جلدی سیکھیں گے۔ مجھے ابتدا میں اردو کی ضرب الامثال اور محاوروں کو سمجھنے میں کچھ دشواری پیش آتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ مشکل آسان ہوگئی۔
- آپ کے نزدیک اردو زبان کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟
- میرے خیال سے اردو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں گفتگو اور تحریر کی زبان بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اردو میں جو زبان بولی جاتی ہے وہی لکھی جاتی ہے (ادبی زبان کا معاملہ اور ہے) جبکہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں بول چال کی زبان تحریر کی زبان سے مختلف ہوتی ہے جبکہ اردو میں ایسی بات نہیں، یہ اس زبان کی بہت بڑی خوبی ہے۔ اردو زبان کی دوسری خوبی اس کی شاعری ہے۔ مجھے اردو شاعری شروع ہی سے پسند ہے خاص طور پر کلاسیکی شاعری کیونکہ عہد حاضر کی شاعری سے میں بہت زیادہ واقف نہیں ہوں۔ ویسے بھی اردو والے اپنی شاعری کی بہت قدر کرتے ہیں جبکہ انگریزوں کے ہاں ایسا نہیں ہے۔
- کیا کبھی اردو زبان کی کوئی خامی بھی آپ نے نوٹ کی؟
- اردو زبان کی خامی تو نوٹ نہیں کی البتہ اردو لکھنے والوں کے ہاں کئی خامیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ مجھے ایسی اردو پسند نہیں جس میں لکھنے والے بہت مشکل، پیچیدہ اور پرتکلف الفاظ کا بے جا استعمال کرتے ہیں۔ زبان کو زیادہ آسان بنایا جاسکتا ہے۔ جہاں "اس کے علاوہ" سے بات سمجھ میں آتی ہے وہاں "علاوہ ازیں" لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے زبان پر نہیں

بلکہ بعض لکھنے والوں کے اسلوب بیان پر اعتراض ہے۔

- برطانیہ میں اردو زبان کے فروغ میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز(SOAS) کا کیا کردار ہے؟

- میں (SOAS) کے کردار سے بالکل مطمئن نہیں ہوں، دراصل جب (SOAS) کی بنیاد پڑی تو اس ادارے کے قیام کا مقصد ان لوگوں کو زبان سکھانا تھا جو تجارت یا انتظامی امور کے سلسلے میں ہندوستان جاتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ عرصے کے بعد ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگئی لیکن دوسری طرف جب سے اردو زبان بولنے والے لوگ برطانیہ آنے لگے تو بہت سے انگریز ان سے اردو سیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں (SOAS) کو کوئی ایسا انتظام کرنا چاہیے تھا مگر اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ جب میں (SOAS) میں تھا تو میں نے کوشش کی کہ ایسے لوگوں کے لیے مختصر مدت کے کورسز شروع کیے جائیں جو اردو سیکھنے کے خواہش مند ہیں تاکہ وہ اردو زبان کو بول چال کی حد تک سیکھ جائیں کیونکہ ہر شخص اردو میں بی.اے. آنرز کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ میں اس سلسلے میں مختلف شہروں میں جا کر خود اردو پڑھاتا رہا ہوں اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد میں اس کام کو زیادہ وقت دینا چاہتا ہوں۔ اردو کی تدریس کے حوالے سے (SOAS) نے صرف بی.اے. آنرز کرنے والوں کے لیے انتظام کیا ہے حالانکہ اردو بول چال سیکھنے والوں کے لیے مختصر مدت کے کورسز کے اجرا کی زیادہ ضرورت ہے۔ (SOAS) کو چاہیے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کرے۔

- (SOAS) میں جدید اردو شاعری پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے کیا آپ عصر حاضر میں ہونے والی شاعری کی تدریس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

- جب میں (SOAS) کا طالب علم تھا تو اس وقت سلیبس انتہا دقیانوسی تھا کہ اس میں علامہ اقبال تک نہیں تھا۔ اس وقت ایک فضول معیار بنا ہوا تھا کہ جو ادیب یا شاعر زندہ ہے اس کی تخلیقات سلیبس میں نہیں ہونی چاہئیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ (SOAS) کے 1946 کے نصاب میں اقبال کی شاعری نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے اپنے زمانے میں فیض، جوش اور علی سردار جعفری تک کی شاعری کو نصاب میں شامل کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عصر حاضر کے نمائندہ شعرا کے کلام کو نصاب کا حصہ بنانا چاہیے۔ میں جب (SOAS) میں تھا تو معقول لینگویج کورس بنانا اور اردو کی کلاسیکل شاعری پر کام کرنا میری دو اہم ذمے داریاں تھیں۔ لینگویج کورس بنانے میں مجھے بہت وقت لگا اور جب میں نے خورشید الاسلام کی معاونت سے اردو کی کلاسیکل شاعری پر کام کرنا شروع کیا تو اس پر بھی بہت وقت صرف ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ میں عصر حاضر کے نمائندہ اردو شعرا کے ناموں سے تو واقف ہوں مگر مجھے ان کا کلام پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں جدید اردو شاعری کی تدریس عصر حاضر کا ایک اہم تقاضا ہے۔

- جب آپ نے اردو لٹریچر پڑھنا شروع کیا تو کن شاعروں اور ادیبوں نے آپ کو متاثر کیا؟

- مجھے شروع ہی سے غالب بہت پسند ہے اور میں نے زیادہ کام بھی غالب پر کیا ہے۔ ابتدا میں مجھے غالب کے کئی اشعار سمجھ میں نہیں آتے تھے مگر رفتہ رفتہ مجھ پر ان اشعار کے مضامین کا بھید کھلتا گیا۔ غالب کی طرح مجھے میر بھی بہت پسند ہیں۔

- آپ نے سودا پر بھی کچھ کام کیا ہے؟

- میں نے تھوڑا سا کام سودا پر بھی کیا ہے۔ میں نے ان کی ہجویہ نظموں پر تحقیق کی ہے۔ سودا بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔

- اقبال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

- جب میں یہ کہتا ہوں کہ غالب بہت بڑے شاعر تھے اور اقبال بڑے شاعر تھے تو پاکستان کے بہت سے اہل ادب میری اس بات پر ناراض ہوتے ہیں۔ اقبال کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ان کے پیغام کے دو پہلو ہیں مثبت پہلو یہ ہے کہ ان کے کلام میں آفاقیت ہے جس کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک پھیلی اور ان کی شاعری سے مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ اور کمیونسٹ بھی متاثر ہوئے جبکہ اقبال کے کلام کا منفی پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ہر مرحلے پر مسلمانوں کی تعریف کی ہے، مثلاً نادر شاہ نے دہلی میں ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا، اقبال نے اس کی بھی تعریف کی ہے حالانکہ نادر شاہ اقبال کے فلسفے کے مطابق مرد مومن کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں تھے جبکہ میر نے نادر شاہ سے جس نفرت کا اظہار کیا مجھے اس سے اتفاق ہے۔ اگرچہ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں مگر انھوں نے خودی کے حوالے سے جو پیغام دیا ہے وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے بہت مفید ہے۔ اقبال نے اپنی جن نظموں میں پیغام دیا ہے ان میں پیغام زیادہ اور شاعری کم ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے لوگوں کو اس سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔

- آپ میر اور غالب میں کیا تفریق محسوس کرتے ہیں؟

● میر ایک سچے اور مستقل مزاج عاشق تھے۔ انھوں نے جو عشق بھی کیا وہ اس میں وفادار رہے۔ اس کے علاوہ میر بنیاد پرستی کے سخت خلاف تھے اور ان (Fundamentalist) کے سخت دشمن تھے جو اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں "شیخ" کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔ میر کے مقابلے میں غالب کی نظر زیادہ وسیع ہے۔ ان کی شاعری کا منظرنامہ پوری کائنات ہے۔ وہ مرتے دم تک انسان کی جستجو کے قائل ہیں وہ کسی منزل کو انسان کی آخری منزل نہیں سمجھتے۔ مجھے غالب کی انسان دوستی اچھی لگتی ہے۔

● اس وقت برطانیہ کے اسکولوں میں جو اردو پڑھائی جارہی ہے کیا آپ اس کے نصاب سے مطمئن ہیں؟

● ابتدا میں جب برطانوی اسکولوں میں اردو کی تدریس کے لیے سلیبس ترتیب دیا گیا تو وہ انتہائی ناقص تھا۔ اب بھی جو سلیبس پڑھایا جارہا ہے وہ بہت معیاری نہیں ہے لیکن پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ پرانے نصاب میں ترجمے پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ میں نے آج سے دس پندرہ برس پہلے اس نصاب کی تبدیلی کے سلسلے میں جو کام کیا اس میں اردو بولنے کو بہت اہمیت دی گئی تھی۔ اسی طرح مجھے یونیورسٹی کے کورس پر بھی یہ اعتراض رہا کہ وہاں طالب علموں کو اردو بولنا نہیں سکھائی جاتی تھی اور میرا خیال ہے کہ جب تک کسی کو زبان بولنا نہیں آتی وہ ادب اور بالخصوص شاعری کو نہیں سمجھ سکتا، مثلاً جس طالب علم کو اردو زبان بولنا نہیں آتی وہ میر کے اس مصرع "دیکھا، اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا" کو "دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا" یعنی "بیماریٔ دل نے دیکھا" سمجھ کر پڑھے گا۔

بہرحال! بات چونکہ اردو کی تدریس اور نصاب کی ہورہی تھی اس حوالے سے میں اردو زبان کی تدریس سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ برطانیہ کے اسکولوں میں اردو پڑھانے والے اکثر استاد اچھے نہیں ہیں۔ اکثر اساتذہ نے اردو کی تدریس کو روزی کمانے کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ روزی کمانا کوئی بری بات نہیں لیکن صرف روزی کمانے کے لیے پڑھانے والے اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کرتے اور جو پڑھے لکھے لوگ اردو پڑھا رہے ہیں وہ عام لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ عموماً اسکولوں میں ایسے بچے اردو پڑھنے کے لیے آتے ہیں جن کے والدین ان پڑھ ہوتے ہیں یا پھر بہت کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں جن کو ادب یا شاعری سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اس لیے اردو پڑھانے والے بیشتر اساتذہ ان لوگوں کے مقابلے میں خود کو بہت معتبر سمجھتے ہیں۔ جب تک کوئی استاد بچوں سے محبت نہ کرے وہ ان کو پڑھا نہیں سکتا مگر بدقسمتی سے یہ استاد بچوں سے محبت نہیں کرتے۔ دوسرا المیہ یہ ہے کہ اردو پڑھانے والے استاد بچوں کو اپنے ذہنی معیار کے حساب سے پڑھاتے ہیں۔ وہ ان کو اس انداز سے اردو پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح انھوں نے خود بیس، تیس سال پہلے اردو پڑھنا سیکھی تھی جہاں ہرطرف اردو سنی اور بولی جاتی تھی۔ ایک بار میں ناٹنگھم کی ایک مسجد میں گیا جہاں کچھ بچے، بچیاں اردو پڑھ رہے تھے۔ میں نے ایک بچے سے ایک جملہ پڑھنے کو کہا جس میں ایک لفظ رب تھا، میں نے اس بچے سے رب کا مطلب پوچھا تو اس نے رب کا مطلب (Rabbit) بتایا۔ یہ مثال بتانے کا مطلب ہے کہ بچوں کو صرف اردو پڑھا دی جاتی ہے، اساتذہ کو اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ بچوں کو اس کا مطلب سمجھ میں آتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح بچوں کو جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس کا ان کے ماحول سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔ برطانیہ کے بچوں کو پاکستان میں چھپے ہوئے قاعدوں کے ذریعے سے اردو پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان قاعدوں میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں، کیونکہ یہاں پیدا ہونے والے بچوں کو پاکستان کے ماحول کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا اس لیے وہ ان قاعدوں میں دیے گئے حوالوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بریڈفورڈ میں پیدا ہونے والے بچے کو پاکستان یا میرپور کے کسی گاؤں کے بارے میں کسی بات کا علم نہیں ہوگا پھر بھی اردو کی تدریس غنیمت ہے لیکن یہاں اسکولوں میں اس طرح اردو نہیں پڑھائی جارہی جس طرح پڑھائی جانی چاہیے۔

● کیا یہاں اردو کے اساتذہ کی تربیت کا کوئی انتظام کیا جانا چاہیے؟

● ضرور ہونا چاہیے، میں ایک زمانے میں اس سلسلے میں بہت سرگرم رہتا تھا لیکن پھر مجھے اس لیے کنارہ کش ہونا پڑا کہ میں اردو ادب کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا اور میرے پاس وقت نہیں تھا۔ ایک بار ایک اسکول میں اردو پڑھانے کے لیے استاد کی ضرورت پیش آئی تو اردو اساتذہ سے انٹرویو کے لیے جو پینل ترتیب دیا گیا ان میں سے کسی کو بھی اردو کا ایک لفظ نہیں آتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اردو پڑھانے والوں کے لیے دیگر جدید زبانوں کی طرح کوئی تدریسی معیار ضرور مقرر کیا جانا چاہیے۔ اردو کے ہر استاد کو ایک سال کے لیے عبوری طور پر مقرر کیا جائے اور سال بعد یہ جائزہ لیا جائے کہ وہ اردو کی تدریس کا کام احسن طریقے سے کرسکتا ہے یا نہیں مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ کسی کو اس سے دلچسپی نہیں۔

□□□

رالف رسل

اردو سیکھنا

جب میں نے سواس میں اردو پڑھنی شروع کی تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ہندوستان میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ اور اپنے دو ساتھی ہندوستانی افسروں کے ساتھ (محمد نواز خاں، جو پٹھان تھے، اور گوپال سنگھ، جو سکھ تھے) برابر اردو بولتا رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ مجھے اردو اچھی خاصی آتی ہے۔ ایک حد تک یہ ٹھیک بھی تھا، لیکن میں اردو ادب سے بالکل ناواقف تھا۔ البتہ ایک خاص قسم کی ادبی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ وہ اس طرح کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے 1942 کے بعد مارکس اور اسٹالن کی بعض تصانیف کے اردو ترجمے شائع کرنے شروع کیے تھے اور میں نے ان میں سے بعضوں کو ڈکشنری کی مدد سے پڑھا بھی تھا۔ پھر بھی جب اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے کافی صدمہ پہنچا، اور فوراً احساس ہوا کہ مارکسزم کی زبان اور اردو ادب کی زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اتفاق سے سب سے پہلے مجھے نذیر احمد کی ''توبۃ النصوح'' پڑھنی پڑی جس کے پہلے باب کی زبان بہت سے اردو والوں کے لیے بھی کافی مشکل ہے۔ چند جملے پڑھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ ''ہنوز دلی دور است'' اور یہ کہ تین سال پڑھنے کے بعد اردو میں فرسٹ کلاس آنرز لانا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ خیر، میں کافی محنت کرتا رہا اور مجھے فرسٹ کلاس مل ہی گیا۔

اسی قسم کی خوش فہمی سنسکرت کے بارے میں بھی تھی جسے میں نے اپنے ضمنی مضمون کے طور پر اختیار کیا تھا۔ کیمبرج میں میں نے لاطینی اور قدیم یونانی پڑھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دونوں زبانیں گویا سنسکرت کی بہنیں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس کا مطالعہ بھی میرے لیے مشکل نہیں ہوگا، لیکن یہ اندازہ بھی غلط نکلا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ ان دنوں میرا خیال تھا کہ اردو اور سنسکرت پڑھنے کے بعد شمالی ہند کی دوسری زبانیں سیکھنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوگی۔ جب میں نے ان ساری خوش فہمیوں کو دور کیا اور صحیح صورت حال سے واقف ہو گیا تو میں نے پوری تندہی کے ساتھ اپنی مشکلات کا سامنا کیا اور تین سال کی مستقل محنت کے بعد (جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے) فرسٹ کلاس میں بی۔اے۔ آنرز کا امتحان پاس کر لیا۔

یہاں میں اردو کے اس نصاب کے بارے میں کچھ اور بتانا چاہتا ہوں جو اس زمانے میں رائج تھا۔ شاعری میں ایک ہی کتاب مقرر تھی۔ اس کا عنوان تھا ''نظم منتخب''، اور یہ کتاب آزادی سے پہلے کی انڈین آرمی کے ان انگریز افسروں کے لیے مرتب کی گئی تھی جو اردو پڑھتا اور انڈین آرمی کے اردو امتحانات دینا چاہتے تھے۔ کتاب ویسے بری نہیں تھی۔ اس میں ولی کے زمانے سے لے کر اکبر الہٰ آبادی کے زمانے تک کے بڑے بڑے شعرا کے کلام کا انتخاب تھا۔ بعض لمبی نظمیں پوری کی پوری اس میں شامل تھیں، مثال کے طور پر میر انیس کا مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' اور حالی کی مسدس۔ اکبر کے بعد کے کسی شاعر کا انتخاب اس میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کتاب 1909 میں مرتب کی گئی تھی۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت تھی جس پر مجھے ہنسی آئی۔ وہ یہ کہ اس میں کوئی ایسا شعر نہیں تھا جس میں انگریزوں پر تنقید کی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اکبر کے سب سے زیادہ جاندار اشعار اس میں ناپید تھے۔ مجھے یہ جان کر بڑا تعجب ہوا کہ سواس کے نصاب میں اقبال کی بھی کوئی نظم نہیں تھی۔ اس زمانے میں یہ عام اصول تھا کہ کسی انتخاب میں ایسے شاعر یا ادیب کی تصنیف نہیں ہونی چاہیے جو اس وقت زندہ ہو۔

لیکن اقبال کی وفات نو سال پہلے ہو چکی تھی۔ جب میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں کو یہ بتایا تو ان کو --- بجا طور پر --- حیرت ہوئی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ میرے استاد اے۔ ایچ۔ ہارلی تھے اور انھوں نے نصاب میں صرف وہی کتابیں رکھی تھیں جو انھوں نے خود ایک پرانے استاد سے پڑھی تھیں جسے وہ ہمیشہ ''مائی اولڈ منشی'' ("My old Munshi") کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ میں ہارلی صاحب کے پہلو میں بیٹھا ''نظم منتخب'' پڑھتا تھا۔ اس کے حاشیے بہت چوڑے تھے اور وہ تمام ان نوٹس سے بھرے ہوئے تھے جو ''مائی اولڈ منشی'' نے لکھائے ہوں گے۔ میں اس بات کو ثابت تو نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ہارلی صاحب کوئی کتاب، کوئی نظم یا کوئی شعر نہیں پڑھا سکتے تھے جسے ''مائی اولڈ منشی'' نے ان کو نہ پڑھایا ہو۔ اس بات کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب میں نے ہارلی صاحب کو بتایا کہ میں نصاب میں اور چیزیں شامل کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے فوراً کہا، ''مگر ان نئی چیزوں کو آپ کیسے پڑھائیں گے؟'' میں نے کہا کہ جب کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئے گی تو میں بلگرامی سے اس کی تشریح کرنے کو کہوں گا۔ میرے اس جواب سے ان کو تعجب ہوا، لیکن وہ خاموش رہے۔

فائلیں چنی ہوئی ہیں۔ رالف کے پاس آڈیو کیسٹس کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرے میں وہ تمام مواد ریکارڈ ہے جس کی مدد سے وہ سواس (School of Oriental and African Studies) میں اپنے طالب علموں کو اردو سننے، سمجھنے اور بولنے کی مشق کراتے تھے۔ زبان دانی کے مختلف سطح کے کورسوں کے لیے الگ الگ ٹیپ ہیں جن کا ایک باقاعدہ کیٹلاگ ہے۔ اس تدریسی مواد میں فیض احمد فیض، ظ انصاری اور عبادت بریلوی وغیرہ کے وہ انٹرویوز بھی شامل ہیں جو رالف نے سواس کی لینگویج لیب میں خود ریکارڈ کیے تھے۔ اس کے علاوہ غالب، میر، سودا وغیرہ کا کلام تحت اللفظ اور ترنم میں رکارڈ کیا ہوا ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں بھی شامل ہیں؛ افسانوں اور ناولوں کے اقتباسات کے ریکارڈ ہیں؛ ہندستان پاکستان کے دیہات، قصبوں، شہروں کے طرز معاشرت پر، فرقہ وارانہ فسادات، مذاہب وعقاید، موسیقی اور دیگر بہت سے موضوعات پر گفتگو اور انٹرویوز شامل ہیں۔ آڈیو کیسٹس کی یہ اہم لائبریری رالف کی زندگی بھر کی لگن، محنت اور ایک فرض شناس استاد کے غور وفکر کے ساتھ مسلسل کام کرنے کی عادت اور تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششوں کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

میں تقریباً ایک مہینہ رالف کے گھر میں مقیم رہی۔ میرا یہ قیام ایک خوشگوار اور یادگار تجربہ اس لیے ہے کہ اس عرصے میں مجھے رالف کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ رالف 86 برس کے ہیں، صحت بہت عمدہ ہے اور ایک ہی نشست میں جوانوں سے زیادہ دیر تک کام کر سکتے ہیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی، برتن دھونا، کپڑے مشین میں لوڈ کرنا، سوکھنے کے بعد انھیں تہہ کر کے رکھنا، بازار سے ہر روز ضرورت کی اشیا اور کھانا خرید کر لانا وغیرہ سب کچھ وقت پر اور پھرتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ رالف نے بتایا کہ جب سے ان کے پیس میکر (pacemaker) لگا ہے وہ بغیر تھکے ہوئے بہت دیر تک کام کر سکتے ہیں۔ ساتھ میں ہمیشہ کسی نہ کسی گیت کی دھن ان کے لبوں پر رہتی ہے، یا پھر کوئی لطیفہ، کوئی برجستہ جملہ اور پھر قہقہہ۔ رالف بہت زندہ دل شخص ہیں اور صاف دل بھی۔ وہ لوگوں کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے رکھتے ہیں اور مناسب موقعوں پر اس کا اظہار بھی کرتے ہیں— نہ خوبیوں کے بیان میں کنجوس ہیں اور نہ خرابیوں کے ذکر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرتے ہیں۔ ان کے دوست اور ان کے بچے، سب انھیں رالف کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں، اور مجھ سے بھی انھوں نے یہی توقع کی کہ ان کے پہلے نام سے انھیں پکارا کروں۔ دوستوں سے بے حد محبت کرنے والے دوست ہیں اور دوستی میں کسی قسم کے تکلف اور رازداری کو مناسب نہیں سمجھتے۔ ان کے دوست جن میں ہر عمر کے مرد اور عورتیں شامل ہیں، ان سے اپنے ہر قسم کے نجی مسائل پر گفتگو کر لیتے ہیں۔ اپنے تینوں بچوں، ای اَن، سیرہ اور ایلین کے بھی وہ ایسے ہی بے تکلف دوست ہیں۔

رالف کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ جس شخص سے بھی ملتے ہیں اسے شخصی طور پر سمجھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور اس کے پس منظر کو بھی۔ انھوں نے مجھ سے بھی میرے حالات معلوم کیے، میرے وطن سکندرآباد کے بارے میں پوچھا، دلی سے کتنی دور ہے، کس سمت میں، کتنی آبادی ہے، مسلمان اور ہندو آبادی کا تناسب کیا ہے، دونوں فرقوں کے آپسی رشتے کیسے ہیں، معاشی اور تعلیمی صورت حال کیا ہے، میرے خاندان میں کون کون لوگ ہیں، ان کا ذریعۂ معاش کیا ہے، لڑکی ہو کر ایک چھوٹے سے قصبے میں کیوں کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکی، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان کے سب سوالوں کا جواب (جو غالباً تسلی بخش ہی ہوگا) دیا۔ اس میں سے انھوں نے بہت سی باتیں اپنے روزنامچے میں درج کرلیں۔

روزنامچہ لکھنے کا ان کا طریقہ یہ ہے کہ کاغذ کی چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر (جو بازار میں غالباً یادداشتیں درج کرنے کی غرض ہی سے ملتی ہیں) وہ ہر روز کے اہم واقعات کے اشارے تاریخ کے ساتھ درج کر لیتے ہیں، اور پھر غالباً ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ ان واقعات کی تفصیل درج کرتے ہیں۔ بول کر لکھانے کے عادی ہیں اور اس کام کے لیے وہ کسی ٹائپسٹ کی خدمات لیتے ہیں۔ روزنامچے میں وہ اپنے گھریلو معاملات ومحسوسات سے لے کر ایسے اہم سیاسی واقعات تک کا ذکر کرتے ہیں جن پر وہ اپنی ایک رائے رکھتے ہیں اور اپنے قارئین تک اسے پہنچانا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس روزنامچے کی جس میں ہر طرح کی تفصیلات درج ہوتی ہیں، وہ کئی نقلیں (غالباً سات) تیار کرتے ہیں اور ڈاک سے اپنے بیٹے ای ان کو، دو بیٹیوں سیرہ اور ایلین کو، اپنے بڑے بھائی ریکس کو، اپنے پرانے دوست کرس فری مین کو اور اپنی ایک اور دوست اور شاگرد میرین مولٹینو اور ان کی بیٹیوں ے اور شیرون کو بھیجتے ہیں۔ اپنے اکادکا کام کی سال بھر کی روداد بھی وہ تیار کرتے ہیں اور اس کی کاپیاں اپنے تمام ملنے والوں اور دوستوں کو بھیجتے ہیں۔ یہ ان کا برسوں پرانا معمول ہے۔

لندن آنے سے قبل میں ان سے دلی میں صرف ایک بار ملی تھی، غالباً 1998 میں جب وہ جامعہ میں اپنے دوست سجاد صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں جے این یو میں پی ایچ ڈی کی طالبہ تھی اور ہم نے جے این یو کے لٹریری کلب کی طرف سے ان کو مدعو کیا تھا۔ ان کو تقریر کے لیے راضی کرنے کی ذمے داری اطہر فاروقی کے سپرد کی گئی تھی کیونکہ وہ ان کو ذاتی طور پر جانتے تھے، ان سے کئی بار مل چکے تھے اور رالف کا ایک طویل انٹرویو بھی انھوں نے لیا تھا جو اردو اور انگریزی میں کئی جگہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد رالف سے بھی کبھار خط وکتابت ہوتی رہی۔ مستقل رابطہ جولائی 2002 میں شروع ہوا جب انھوں نے اپنی خودنوشت کی ایک کاپی بھیجی اور اس کے کچھ حصے پڑھ کر مجھے لگا کہ یہ ایک الگ ہی نوعیت کی سوانح ہے، اردو میں اس قسم کی تحریریں تقریباً نایاب ہیں اور اگر اس کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تو یہ ایک دلچسپ کام ہوگا۔ میں نے پہلے باب کا ترجمہ کر کے رالف کو بھیجا۔ پڑھ کر وہ اس کے معیار و مزاج

سے بہت متاثر ہوئے اور تجویز رکھی کہ میں لندن میں انؒ کے ہاں قیام کروں اور اس کام کو مکمل کر ڈالوں۔ جواباً میں نے انھیں لکھا کہ میرا لندن جانا بے سود ہوگا کیونکہ یہ کام میں دہلی میں رہ کر بھی کرسکتی ہوں، البتہ اس کو آخری شکل دینے کے لیے میں لندن آ سکتی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اس سے میرے دوسرے کاموں کا بھی حرج نہیں ہوگا۔ رالف کو یہ تجویز پسند آئی اور اس طرح میں نے کام شروع کردیا۔ لیکن ان دنوں میں بہت معروف تھی، نوکری کرتی تھی اور اردو کے سرکاری ماہنامے 'اردو دنیا' کی ادارت کی تقریباً تمام ذمے داریاں مجھے چین کی سانس نہ لینے دیتی تھیں۔ اتفاق سے دہلی یونی ورسٹی میں لیکچرر کی پوسٹ کے لیے انٹرویو ہوئے اور نومبر 2002 میں میرا تقرر ہوگیا۔ نئے ماحول اور نئی ذمے داریوں کو دیکھنے، سمجھنے اور ان سے مانوس ہونے میں کچھ وقت اور گزر گیا مگر ای میل کے ذریعے رالف سے رابطہ مسلسل رہا۔ بہرکیف، جب گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو میں نے سوانح کے ترجمے کا کام سنبھال لیا۔ 2 مئی 2003 سے دوسرے باب پر کام کرنا شروع کیا اور 17 جولائی کو 334 صفحے کی اس سوانح کا آخری باب ختم کر ڈالا۔ دہلی یونی ورسٹی کا تعلیمی سیشن 16 جولائی سے شروع ہوتا ہے، اس لیے سوانح کے ترجمے کو رالف کی مدد سے آخری شکل دینے کے لیے ایک سال کا انتظار ناگزیر ہوگیا۔

میں 8 جون 2004 کو لندن پہنچی اور اگلے دن سے ہم نے کام شروع کردیا جو 29 جون کو اکیس دن کی مدت میں ختم ہوگیا۔ ہمارا معمول یہ تھا کہ اپنے اپنے کاموں اور ناشتے سے فارغ ہوکر ہم دونوں صبح نو بجے تک میز پر جا پہنچتے تھے۔ میں ترجمے کی دو کاپیاں لے کر گئی تھی۔ میں سناتی جاتی اور رالف دوسری کاپی میں ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے۔ جہاں اردو عبارت واضح نہ ہوتی یا لفظوں کا تلازمہ ترجمے کی صحت پر شبہ کا محرک ہوتا ہم لوگ انگریزی متن سے رجوع کرتے اور جملے کو پھر سے ترتیب دیتے۔ اس ڈھب سے دوپہر تک کام جاری رہتا۔ پھر ہم لوگ اٹھ کر کھانا گرم کرنے رکھتے، یا اگر کھانا گھر میں نہ ہوتا تو Marks and Spencer یا سپر مارکیٹ ASDA سے کھانا خرید کر لاتے۔ جتنی دیر میں کھانا گرم ہوتا ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرتے جو کھانے کے دوران بھی جاری رہتیں۔ گفتگو کا موضوع عام طور پر رالف کے حالاتِ زندگی، ہندستان میں ان کے تجربات وغیرہ ہوتے۔ اردو کے معروف لوگ جو ان کے رابطے میں رہے، رالف ان کے بارے میں بتاتے، ان میں سے اکثر باتیں بڑی دل چسپ ہوتیں۔ کبھی کبھی ہندستان کی سیاسی صورتِ حال، کیونسٹ پارٹی اور جے این یو میں طلبہ کی سیاسی سرگرمیاں، سیاست سے میری وابستگی وغیرہ پر بھی بات ہوتی۔ کھانے کے بعد ہم لوگ عموماً چھوٹا سا بریک لیتے تھے اور جلد ہی دوبارہ کام کرنے بیٹھ جاتے۔ بعض دفعہ جب کام کو جی نہ چاہتا تو رالف کہتے، 'میں اب قیلولہ فرماؤں گا۔' ایسا وہ طنزاً کہتے تھے کیونکہ 'فرمانا' جیسے لفظوں کے استعمال کو وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے چھوٹے موٹے لیکن ضروری کام کرنا چاہتے تو کہتے تھے، 'Now I'll do my *little fat* works.' (چھوٹے موٹے کاموں کا لفظی ترجمہ رالف نے یہی کر رکھا تھا)۔ رالف کو ایک ساتھ دو کپ چائے پینے کی عادت ہے — دن میں ایک ہی بار، سہ پہر کو۔ صبح کو وہ کافی پیتے ہیں۔

رالف رسل کی خودنوشت تین جلدوں کو محیط ہوگی۔ پہلی جلد شائع ہوچکی ہے جس کے ترجمے کا کام میں مکمل کرچکی ہوں۔ وہ دوسری جلد لکھ چکے ہیں اور تیسری لکھ رہے ہیں۔ پہلی جلد 1946 تک کے واقعات کو محیط ہے — یعنی اس وقت تک جب وہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ہندستان سے لندن واپس لوٹے اور فوجی زندگی سے سبکدوش ہوکر اردو میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے انھوں نے سواس میں داخلہ لیا۔ یہ خودنوشت سوانح اس اعتبار سے بہت دل چسپ ہے کہ اس میں رالف کے بچپن کے واقعات، والدین، بھائیوں، رشتے داروں، دوستوں اور دیہات کے لوگوں کے ذکر؛ پھر اسکول، اساتذہ، وہاں کے ماحول، تربیت وغیرہ کے ذکر میں اس قدر والہانہ وابستگی اور جوش و جذبہ ہے کہ قاری بھی اپنے آپ کو اسی ماحول کا ایک حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اسکول کے بعد کیمبرج کی زندگی (خصوصاً وہاں کی وہ حماقتیں جو ایک مخصوص احساسِ برتری کی غماز ہیں)، کیونسٹ تحریک سے وابستگی، جنگ کے خلاف سرگرمیاں، جنگ کے زمانے کی وہ تاریخ جسے یوروپ و برطانیہ کے اربابِ اقتدار نے مسخ کرکے پیش کیا ہے؛ برطانوی حکومت کی نااہلی، ہٹلر کو راضی رکھنے کے لیے انگلینڈ اور فرانس کی پالیسیوں پر کھلی نکتہ چینی اور جنگ کے تئیں عوام کے موڈ کی تفصیلات آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ اپنے کیونسٹ بننے کے اسباب، کیونسٹ ساتھیوں کے رویوں کا تجزیہ، کیونسٹ تحریک کی خوبیاں خرابیاں جو رالف نے محسوس کیں، اور ان سب واقعات کے تسلسل میں ان کی اپنی شخصیت کا ارتقا کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ قاری کے دل میں ان کے واضح خیالات اور دوٹوک ایماندارانہ لہجے کی قدر مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔ وہ قاری کو اعتماد میں لیتے ہوئے مکمل وابستگی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اپنی ذاتی زندگی (جس میں جنسی زندگی بھی شامل ہے) کا ذکر بھی انھوں نے اسی کھلے پن سے کیا ہے، جو ہوسکتا ہے اردو معاشرے میں بہت سے لوگوں کو پسند نہ آئے، حالانکہ معاصر ہندستان میں، خصوصاً بڑے شہروں میں اور انگریزی نظامِ تعلیم میں اب جنسیات کی تعلیم اور اس کے مسائل پر گفتگو خاصی عام ہوچکی ہے اور اس کھلے پن کو اب شہری تعلیم یافتہ متوسط طبقے میں قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔

ایک دن مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ ان کی سوانح کے اس حصے کا ترجمہ دیکھ رہے تھے جس میں اس دور کا ذکر ہے جب فرانس پر جرمنی کے قبضے کے بعد برطانیہ کے بمبار طیارے ہر روز اڑان بھرتے تھے اور فرانس پر بم برسا کر لوٹتے تھے۔ ان میں سے تقریباً ہر روز ہی ایک آدھ طیارہ گرا لیا جاتا تھا۔ رالف کا چھوٹا بھائی ولفریڈ جو ہوائی فوج میں navigator تھا، یعنی نقشوں کی مدد سے سمت

اور حملے کے لیے نشانے وغیرہ کے تعین میں مدد کرتا تھا، ایسی ہی ایک اڑان کے دوران فرانس کے اوپر مارا گیا۔ اس حصے پر پہنچ کر رالف نے مجھے پڑھنے سے روک دیا اور تفصیل سے بتانے لگے کہ ہوائی فوج کے سپاہیوں کو کس قدر شدید خطرات درپیش تھے۔ ان میں سے ہر فوجی محسوس کرتا تھا کہ اس کی باری آج ہی آسکتی ہے۔ ان کی نفسیاتی کیفیت اور خدشات کا ذکر کرتے کرتے رالف کی آنکھیں بھیگ گئیں اور ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں نے بھی جنگ کی شدید ہولناکیوں کو پہلی بار اتنی شدت سے محسوس کیا۔ میں نے بے ساختہ ان کا ہاتھ تھپتھپایا اور پریشان ہو کر شاید تسلی کے چند مہمل سے جملے بھی بولے۔ رالف نے میری طرف دیکھا اور بڑی اداسی کے ساتھ مسکرا کر کہنے لگے، 'مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم میرے ذہن اور جذبات کو اچھی طرح سمجھتی ہو۔' ایک اور موقعے پر انھوں نے بڑے جوش کے ساتھ خوش ہو کر کہا کہ اگر ہم دونوں اسی طرح ہر روز کام کرتے رہیں تو میں جتنا خوش ہوں اس سے توقع کر سکتا ہوں کہ میں ڈیڑھ سو سال تک کام کر سکتا ہوں۔

فوجی افسر کے طور پر رالف رسل جس یونٹ کے انچارج تھے وہ جنوبی ہند کے سپاہیوں پر مشتمل تھا اور اس کو آسام کے سرحدی علاقے دیما پور میں تعینات کیا گیا تھا۔ اپنے یونٹ کے سپاہیوں میں سیاسی بیداری لانے اور طبقاتی شعور پیدا کرنے کے لیے انھوں نے مسلسل کام کیا۔ یہ کام انھیں اپنے انگریز افسروں کے شک کے دائرے میں آئے بغیر کرنا تھا۔ یہ کام نہایت ہی خطرناک تھا کیونکہ ان کی سرگرمیوں کا راز کھل جانے پر ان پر غداری کا الزام لگ سکتا تھا۔ دوسری طرف ہندوستانی سپاہیوں کا اعتماد حاصل کرنا بھی بڑا صبر طلب کام تھا کیونکہ اس سوال کا جواب آسان نہ تھا کہ ایک انگریز افسر محکوم ہندوستانیوں کا خیر خواہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ لیکن رالف پر تو اپنے مقاصد کے حصول کی دھن سوار تھی۔ ان کے کیمونسٹ نظریات کا تقاضا تھا کہ وہ جہاں بھی رہیں عوام کی بہبود کے لیے کام کریں، ہندوستان کو جب بھی آزادی ملے، اقتدار عوام کے ہاتھ میں ہی جائے، عوام کو اس کا احساس دلانا ضروری تھا۔ عوام میں بیداری لانے کے لیے کام کرنا بھی ضروری تھا۔ اپنے یونٹ کے سپاہیوں کے سوا عوامی رابطے کی کوئی سبیل رالف کے پاس نہ تھی۔ فوج میں بھرتی ہونے والے تمام ہندوستانی سپاہی غریب کسان اور مزدور ہی ہوتے تھے جن میں سے زیادہ تر پیٹ سے مجبور ہو کر فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ ان سپاہیوں کے درمیان سیاسی بیداری کا کام بھی دراصل عوامی بیداری ہی کا کام تھا۔ یوں رالف نے ثابت قدمی کے ساتھ کام شروع کر دیا اور آخرش اپنے یونٹ میں کیمونسٹ پارٹی کے ہمدردوں اور حامیوں کا ایک گروپ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے تمل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبانوں کا کیمونسٹ لٹریچر بھی اپنے سپاہیوں کو فراہم کرانا شروع کر دیا اور پارٹی کا دائرہ بڑھانے کے امکانات پر غور کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کیمونسٹ لیڈروں پی سی جوشی اور اندرجیت گپتا وغیرہ سے رابطہ رکھا اور ان کو رپورٹیں بھیجتے رہے۔ اندرجیت گپتا کی خواہش پر انھوں نے اس پر بھی ایک تفصیلی نوٹ تیار کیا کہ فوجوں میں کیمونسٹ تحریک کو فروغ دینا کس لیے ضروری ہے اور یہ کس طرح ہونا چاہیے۔ ان تجاویز کا ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ رالف کو افسوس ہے کہ ہندستان کے کیمونسٹ لیڈر بھی عوام کی بات تو کرتے ہیں لیکن عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں لیتے۔ لیڈروں نے ان کی بات کو توجہ سے سنا تو لیکن اس کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور اس طرح ان کی تجاویز ٹھنڈے بستے میں چلی گئیں۔ مگر اس سے رالف ہمت باختہ نہیں ہوئے اور وقتاً فوقتاً اپنی تجاویز کی یاد دہانی کراتے رہے۔

23 اگست 1945 کو رالف رسل لندن واپس لوٹ گئے۔ جلد کی کوئی بیماری انھیں ہوئی تھی جس کی تشخیص نہ ہو سکی اور انھیں چند مہینوں کی چھٹی دے کر علاج کے لیے لندن کے دو اسپتالوں میں بھیجا گیا۔ پھر جنگ بند ہو گئی اور اس طرح چھٹیوں کے دوران ہی ان کی فوجی ملازمت ختم کر دی گئی، جبکہ وہ ہندستان واپس لوٹ کر کچھ برس کیمونسٹ تحریک کے لیے کام کرنا چاہتے تھے۔ ملازمت کے خاتمے کے ساتھ ہی ان کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ وہ لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف ایشین اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو کے طالب علم ہو گئے اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہیں اردو کے لیکچرر کے طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔ اور اس طرح ان کی اکادمک زندگی کی شروعات ہو گئی۔

رالف کے اندر معاملات کی تمام پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کی تہہ تک پہنچنے کا جو تجسس ہے، ان کا صحیح تجزیہ کر کے درست نتائج تک پہنچنے کی جو بے چینی ہے، سماجی نظام کو بدلنے اور انسان دوستی کے نصب العین کو عام کرنے کی جو لگن ہے اس نے انھیں کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ چنانچہ سواس کے حکام کے ساتھ ان کا کبھی نباہ نہ ہو سکا۔ اپنے ہم خیال رفقا کے ساتھ وہ حکام کے رویوں کے خلاف اکثر محاذ آرا رہے، انھیں کریر میں نقصان پہنچانے کی دھمکیاں بھی ملیں اور ان کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا، یعنی ان کو پروفیسر نہیں بنایا گیا اور وہ ریڈر کے عہدے سے رٹائر ہوئے۔ رالف سے ناراضگی کے باوجود انھیں نوکری سے اسی لیے نہیں نکالا گیا کہ وہ بہت اچھے استاد تھے۔

رالف اب تنہا رہتے ہیں۔ عرصہ ہوا جب انھوں نے اور ان کی بیوی مولی نے علاحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، اور دونوں ہی اپنے اس فیصلے سے خوش ہیں۔ تینوں بچے اپنی ماں سے بھی ملتے جاتے ہیں لیکن رالف کے ساتھ ان کے تعلقات زیادہ خوش گوار ہیں۔ اپنی زندگی میں آنے والے ہر شخص، زندگی کے ہر موڑ، ہر اہم واقعے، اور اس پر اپنے ردعمل وغیرہ کے بارے میں رالف کے خیالات بالکل واضح ہیں؛ ہر شے کے بارے میں ان کی رائے بے

لاگ ہے، اتنی بے لاگ کہ رشک آ جائے۔ تبھی تو ہر عمر کے ان کے دوست اپنے مسائل پر بات کرنے ان کے پاس آتے ہیں اور مطمئن ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ رالف کی شخصیت کی اس خوبی کا اندازہ ان کی سوانح کی ہر سطر سے ہوتا ہے۔ تعریف و تحسین کے جملے ان کو بہکا بھٹکا نہیں سکتے۔ انھوں نے اکثر مجھ سے ان دنوں کا ذکر کیا ہے جب وہ سوانس سے تعلیمی رخصت لے کر علی گڑھ پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ تعلیمی رخصت کے دوران انھوں نے دوسرے شہروں اور گاؤں کا سفر کیا اور کوشش کی عام لوگوں کے ساتھ گفتگو کے انھیں زیادہ سے زیادہ موقعے ملیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ واسطہ ان لوگوں سے پڑتا تھا جو اردو شعبوں سے وابستہ ہیں۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک معمولی لیکچرر ہونے کے باوجود جس طرح ان کی پذیرائی ہوتی تھی اس کا سبب ان کی علمیت نہیں تھی بلکہ انگریز ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ تعظیمانہ رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ اُس وقت بھی رالف کو اس بات کا افسوس تھا اور اب بھی ہے کہ ہندوستان میں ابھی تک لوگوں میں غلامانہ ذہنیت کارفرما ہے۔

ہر بدھ کی شام آٹھ بجے رالف کے پاس کچھ طالب علم اردو سیکھنے آتے ہیں اور ہر دوسری جمعرات کی شام کو ہندی سیکھنے۔ یہ لوگ ویسے تو رسم خط لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں لیکن انھیں بولنے کی مشق نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ طالب علم تو انگریز ہیں اور کچھ کا تعلق یوروپی ممالک مثلاً جرمنی وغیرہ سے ہے۔ بولنے کی مشق کی یہ کلاسیں بھی خاصی دل چسپ ہوتی ہیں اور ان سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ یوروپی لوگوں کو دقت ش ق کی درست ادائیگی میں نہیں بلکہ 'ب' اور 'بھ'، 'ک' اور 'کھ' جیسی آوازوں کے درمیان تفریق میں اور ان کو واضح طور پر ادا کرنے میں ہوتی ہے۔

رالف نہایت شستہ اردو بولتے ہیں لیکن اردو بولنے کی مشق کے زیادہ مواقع نہ ملنے کے سبب اب رالف کو بھی ان دقتوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ مثلاً ایک دن وہ اپنی دوست میرین مولٹینو کی عیادت کر کے لوٹے (جن کے پتے کا آپریشن ہوا تھا) تو مجھے بتانے لگے کہ اسپتال میں میرین کے برابر والے بستر پر جو عورت لیٹی تھی اس نے میرین کو بتایا کہ آپریشن کے بعد اس کے جسم میں ایسے درد ہو رہا ہے گویا کسی گورے نے زور سے لات ماری ہو۔ یہ واقعہ سنا کر رالف خود ہی دیر تک ہنستے رہے اور مجھے بھی اس عورت کی گفتگو کے اس عجیب و غریب انداز پر حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ مجھے لگا کہ سابق کالونیوں کے کچھ لوگ شاید اب بھی انگریزوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ شام کو جب اردو کی مشق والی کلاس شروع ہوئی تو رالف نے اپنے ایک شاگرد ڈیوڈ پیج کو (جو بی بی سی ورلڈ سروس کے انچارج رہ چکے ہیں، اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد اردو بولنے کی مشق کر رہے ہیں) یہی واقعہ اردو میں ایک مرتبہ پھر سنایا۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں پوچھ بیٹھی، "رالف! کیا وہ عورت افریقی نسل کی کالی عورت تھی؟" اب حیرت زدہ ہونے کی باری رالف کی تھی، "کیا مطلب؟" انھوں نے پوچھا۔ میں نے وضاحت کی، "اگر وہ کالوں کی کسی نسل سے تعلق نہیں رکھتی تھی تو پھر گوروں کا ذکر اتنی نفرت سے کیوں کر رہی تھی!" اب جا کر رالف کی سمجھ میں میری بات آئی اور انھوں نے پوری احتیاط سے لفظوں کو ادا کرتے ہوئے کہا، "اچھا تو میں نے 'گورا' کہا ہے! لیکن میری مراد تو 'گھوڑے' سے تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے درست تلفظ کی مشق نہیں رہی۔" اس واقعے پر وہ خاصے محظوظ ہوئے اور کئی دوستوں سے اس کا ذکر کیا۔

ظاہر ہے کہ رالف کو اب اردو بولنے کے بہت ہی کم مواقع میسر ہیں۔ اردو پر اچھی دسترس رکھنے کے باوجود استعمال میں نہ ہونے کے سبب بہت سے الفاظ اور پیرایہ ہائے اظہار پر سے ان کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ اس کا انھیں افسوس تو ہے لیکن زیادہ نہیں کیونکہ ایسا ہونا فطری عمل ہے جس کے تدارک کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سوانح کے اردو متن کو سنتے ہوئے وہ مجھے اکثر روک دیتے تھے اور بتاتے تھے کہ فلاں لفظ کو میں بھول چکا تھا، اب بہت دن کے بعد سن رہا ہوں۔ ایسے بھی بہت سے لفظوں پر انھوں نے مجھے روکا جو ان کے لیے بالکل نئے تھے۔ ان کے معنی سمجھنے کے بعد وہ بچوں کی طرح کچی خوشی کا اظہار کرتے تھے۔

خیر، جب ترجمے کے متن کی تصحیح کے لیے ہم لوگ نہ بیٹھتے تو میں رالف کے کمپیوٹر پر پڑھے ہوئے ابواب کی غلطیاں مٹاتی۔ متن کی سوفٹ کاپی میں اپنے ساتھ لے گئی تھی اور اردو سوفٹ ویئر رالف کے کمپیوٹر پر پہلے ہی ڈلوا چکی تھی۔ اس طرح تصحیح کا کام بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا، اور ہر ایک باب کے فائنل ہونے کے بعد میں اس کی ایک ایک کاپی ای میل کے ذریعے اجمل کمال کو کراچی بھیجتی رہی۔ وہ بھی ترجمے کا متن ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ پڑھتے رہے اور ایڈیٹنگ کے نقطۂ نظر سے اس میں تبدیلیوں کے مشورے دیتے رہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے اور میں اس کو اپنی خوش بختی پر محمول کرتی ہوں کہ اس ترجمے کی اشاعت 'آج' جیسے قابلِ قدر معیاری مجلے میں ہو رہی ہے، اور اس کے لیے میں اجمل کمال کی ذاتی طور پر بہت ممنون ہوں۔ اجمل کے بہترین انسانی اقدار میں یقین اور ان کی ترویج کے لیے ادبی محاذ پر سنجیدہ اور مستقل کوششوں کی میں تہِ دل سے قدر کرتی ہوں، اور اسی مشترکہ مقصد میں یقین رکھنے کے سبب ان کی دوستی کو بے حد عزیز تصور کرتی ہوں۔

12 اکتوبر 2004

□□□

Lecturer of Urdu
Faculty of Arts, Univerisy of Delhi, Delhi-7
Email: a[illegible]amandara@hotmail.com

(بلگرامی کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔)

نثر کی کتابوں کی ایک نامکمل فہرست میں پہلے لے چکا ہوں۔ ان کے علاوہ رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" کا ایک چھوٹا سا انتخاب تھا جس کا عنوان "آزاد کے کارنامے" رکھا گیا تھا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا انتخاب "خوجی کے کارنامے" تھا، لیکن وہ ہمارے نصاب میں نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ "آزاد" اور "خوجی" کی یہ علاحدگی طالب علموں کے لیے مفید نہیں تھی، بہرحال —

ہارلی کے علاوہ دو استاد تھے جنھوں نے مجھے پڑھایا۔ کیپٹن اے۔ آر۔ جڈ (Captain A.R. Judd) اور حامد حسن بلگرامی۔ جڈ صاحب ایک علاحدہ مضمون کے مستحق ہیں۔ ("Urdu and I" میں ان کا ذکر ذرا زیادہ تفصیل سے ہے اور شان الحق حقی نے بھی ان کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔) یہاں صرف ایک واقعہ بتانا چاہتا ہوں جس سے ان کی ایک خصوصیت کا پتا چلتا ہے۔ وہ مجھے "فسانۂ آزاد" کا وہ انتخاب پڑھا رہے تھے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ اس کی زبان سے وہ بے حد محظوظ ہوتے تھے اور بار بار پوچھتے، "یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے۔ کس نے لکھی؟" میں بتاتا رہا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ سرشار کا نام ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اگر اردو ادب سے دلچسپی ہوتی تو ظاہر ہے انھیں معلوم ہوتا کہ سرشار کون تھا۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ ان کو صرف زبان سے دلچسپی تھی، اور خود کہتے تھے کہ "مجھے اردو کے محاوروں (ضرب الامثال سے دلچسپی ہے۔" لیکن زبان پر وہ عبور تھا جو میں نے کبھی کسی اور انگریز میں نہیں دیکھا۔

حامد حسن بلگرامی ایک عہدے پر مقرر تھے جسے سواس کی اصطلاح میں "اوورسیز لکچرر شپ" (Overseas Lecturership) کہتے تھے۔ خدا جانے ان کا تقرر کیسے ہوا تھا؟ انھوں نے کبھی کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھایا تھا۔ سواس آنے سے پہلے وہ ڈون اسکول دہرہ دون میں پڑھاتے تھے اور ان کی واحد تصنیف ایک چھوٹی سی کتاب "خلاصہ نگاری" تھی جو انھوں نے اسکول کے طالب علموں کے لیے مرتب کی تھی۔ ادیب کا مطالعہ کافی محدود تھا۔ فیض کو وہ ہمیشہ "فیض محمد فیض" کہتے تھے اور اقبال کے متعلق ایک دفعہ کہا (انگریزی میں)

"Some mature minds consider that it is too soon to write about him. I myself have not written about him."

ہارلی کا رویہ ان دونوں استادوں کے ساتھ بالکل انگریزی راج کے پرانے انگریزوں کا تھا۔ سمجھتے تھے کہ چونکہ ان کا عہدہ ان دونوں سے برتر ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہر معاملے میں اپنی برتری کا اظہار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے کہا، "جب کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی تو میں بلگرامی سے پوچھوں گا،" تو ان کو تعجب ہوا۔ سمجھے ہوں گے کہ کسی ہندوستانی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا کسی انگریز کے شایان شان نہیں۔ رہے جڈ، تو ہارلی کی نظر میں ان کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ وہ ایک معمولی گورے سپاہی بن کر ہندوستان گئے تھے اور صرف دوسری عالمی جنگ کے غیر معمولی حالات کی بنا پر کپتان بنا دیے گئے تھے۔ انھوں نے کبھی اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔ بی بی سی والی انگریزی نہیں بول سکتے تھے اور ان کا لب ولہجہ خاص نورفوک (Norfolk) کا تھا جہاں وہ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔ ہارلی کی نظر میں قابل قدر صرف ان کا اردو پر حیرت انگیز عبور تھا اور بس۔ اس میں ہارلی کا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، لیکن ہارلی کے لیے اس بات کا اعتراف ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ جڈ مجھے پڑھا رہے تھے کہ ہارلی کمرے میں داخل ہوئے۔ دسمبر کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں اور ہارلی نے مجھ سے پوچھا، "آپ چھٹیوں میں پڑھنے آتے رہیں گے؟" میں نے کہا "جی ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں مسلسل کام کرتا رہوں تو کافی ترقی کر سکتا ہوں۔" ہارلی نے کہا، "مسلسل، نہیں" سلسلے وار"۔ "ان کے جانے کے بعد جڈ نے کہا کہ "ان سے نہ کہیے گا، مگر "مسلسل" ہی ٹھیک تھا۔"

خیر، یہ تھیں میرے استادوں کی کوتاہیاں۔ لیکن ان کوتاہیوں کے مقابلے میں تینوں کی خوبیاں کہیں زیادہ تھیں۔ ہارلی بیچارے بوڑھے ہو گئے تھے اور لندن سے کافی دور رہتے تھے لیکن اپنے آرام کی فکر بالکل نہیں کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی تعطیلوں میں بھی وہ نہ صرف خود سواس پڑھانے آنے کے لیے تیار تھے بلکہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں بھی وہاں آؤں اور ان سے پڑھوں اور عام طور پر میں آتا تھا۔ جڈ نے مجھے اتنی اردو سکھائی کہ کوئی دوسرا انگریز نہیں سکھا سکتا تھا۔ بلگرامی نے بھی پڑھانے میں بڑی محنت کی اور جیسے انگریزی میں کہتے ہیں out of the way جا کے میری مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ جب میں 1949 میں لکچرر مقرر ہوا اور ہندوستان اور پاکستان جانے کی تیاریاں کر رہا تھا تو انھوں نے مجھے ذاکر حسین، احتشام حسین، مولوی عبدالحق اور بعض دوسرے "بڑے آدمیوں" کے نام تعارفی خط لکھ کے دیے، جس سے مجھے بڑی سہولت ہوئی۔

یونیورسٹی کے استادوں کے علاوہ میرے بعض ہندوستانی نے میری بہت مدد کی۔ ہمیشہ سے میرا خیال ہے کہ جب تک آپ اردو روانی سے اور اچھی خاصی صحت کے ساتھ نہ بول سکیں یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آپ کو اردو آتی ہے۔ اس لیے میں نے اردو میں گفتگو کرنے کی مشق کرنی چاہی۔ دو اردو داں، بلکہ اہل زبان، دوستوں نے باقاعدہ ملاقاتیں کر کے اس میں میری مدد کی۔ ایک حیدرآباد دکن کی خاتون سردار محبوب اور ایک یوپی کے صاحب مقبول احمد جو بعد میں علی گڑھ میں پروفیسر ہو گئے.....

اس کے بعد اردو سیکھنے کے عمل کی (محدود معنوں میں) تکمیل 1949-50 میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ "تکمیل" کی منزل کبھی نہیں آتی، لیکن اس تعلیمی رخصت کے ایک سال میں میرا روانی سے اردو بولنا جاری رہا اور میرے اردو الفاظ کے ذخیرے میں بھی خاصا بڑا اضافہ ہوا۔

اب میں تاریخ کی ترتیب کو چھوڑ کر علاحدہ علاحدہ موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہوں گا جو وقتاً فوقتاً ذہن میں آتے رہتے ہیں۔

ان قریب قریب ساٹھ سال کے دوران جن میں مجھے زیادہ سے زیادہ اردو سمجھنے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کا تجربہ رہا ہے میں نے محسوس کیا ہے کہ اردو زبان اور اردو تحریر کے اسلوب میں بعض باتیں ہیں جن کو میں نے کسی دوسری زبان میں نہیں دیکھا۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(1) مبالغہ: اردو والوں کے مزاج میں ایک قسم کی انتہا پسندی ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ میرے انگریزی مضامین کے مترجموں نے اکثر میرے محتاط بیانات کا ترجمہ ایسے جملوں میں کیا ہے جن میں میری احتیاط کی بو تک نہیں آتی۔ ایسے ترجموں کو غلط کہنا غالباً زیادہ صحیح نہیں ہوگا کیونکہ اردو کا محاورہ یہی ہے (حالانکہ میں ان جملوں میں ترمیم کرنا ضروری سمجھتا ہوں!)

(2) اردو لکھنے میں لکھنے والا عام طور پر ایسی تکلف کی زبان لکھنا پسند کرتا ہے جو میرے نزدیک نہ ضروری ہے نہ مناسب۔ بہت سے لکھنے والے فارسی کے استعمال سے اپنی تحریر میں ایک خاص شان پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اکثر پڑھنے والے غالباً سمجھتے ہیں کہ اس سے واقعی ایک خاص شان پیدا ہوئی ہے۔ ان کو یہ بات پسند ہے اور مجھے بالکل پسند نہیں! جب آپ "اس کے علاوہ" لکھ سکتے ہیں تو خواہ مخواہ "علاوہ ازیں" کیوں لکھتے ہیں؟

حال ہی میں ایک صاحب نے مجھے ایک خط میں لکھا ہے "آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔" اگر اس کے بجائے وہ لکھتے، "آپ کا خط ملا،" تو اس میں کیا برائی ہوتی؟ (ایسی بات کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔) اس کے علاوہ ("علاوہ ازیں") ایک اور بات ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی فارسی دانی کی نمائش کرنے کا بڑا شوق ہے، اور یہ جانتے ہوئے کہ اب کم لوگ ہیں جنھیں فارسی آتی ہے جان بوجھ کر فارسی کے اشعار نقل کریں گے۔ خیر، اگر آپ کو کسی موقعے پر کسی فارسی شعر کو نقل کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے تو ضرور نقل کیجیے، مگر اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دے دیجیے تاکہ لوگ آپ کا مطلب سمجھ سکیں۔ جو ترجمہ نہیں دیتے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں یہ مکالمہ ہو رہا ہے:

● سوال: کیا آپ اس کا ترجمہ کر سکتے ہیں؟

● جواب: (جھوٹے تعجب کے ساتھ) اچھا؟ آپ کو فارسی نہیں آتی؟ معاف کیجیے، میں سمجھتا تھا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی فارسی جانتا ہے۔

(ویسے اردو والوں پر کچھ موقوف نہیں بہت سے انگریز مصنف— اب بھی، اگرچہ پہلے کے مقابلے میں کم— اپنی تحریروں میں فرانسیسی اور لاطینی کے اشعار یا عبارتیں نقل کرتے ہیں حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ وہ زمانہ کبھی کا گزر گیا جب تعلیم یافتہ انگریز یہ زبانیں جانتے تھے۔)

(3) cliches کا استعمال: (پتا نہیں کہ cliches کا اردو ترجمہ کیا ہوگا۔) cliche انگریزی میں ایسے لفظ کو کہتے ہیں جو سیدھے سادے الفاظ کے بجائے ذرا زیادہ اثر پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے اور جو ایک زمانے میں واقعی یہ اثر پیدا کرتے بھی تھے مگر اب بار بار استعمال ہونے کی وجہ سے اتنے پٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کوفت ہوتی ہے۔ ویسے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انگریز پڑھنے والے کو کوفت ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اردو پڑھنے والے یہ محسوس ہی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر یہ لکھنے کے بجائے کہ کتاب "چھپی ہے" لوگ لکھیں گے کہ وہ "زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔" یہ مجھے مضحکہ خیز الفاظ معلوم ہوتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اردو پڑھنے والوں کا یہ ردِعمل بالکل نہیں ہوتا۔

(4) اسی سے متعلق ایک اور بات ہے جسے میں نے اکثر دیکھا ہے۔ آپ کسی خاص موضوع پر مضمون یا کتاب لکھ رہے ہیں۔ اصل موضوع پر آنے سے پہلے آپ تمہید کے طور پر ایک ایسی بات بتانا ضروری سمجھتے ہیں جس سے آپ کا ہر قاری پہلے سے بہت ہی اچھی طرح واقف ہے۔ احتشام حسین کی ایک کتاب اردو زبان کے بارے میں ہے۔ کتاب اس وقت میرے پاس نہیں، لیکن اگر مجھے صحیح یاد آتا ہے تو اس کا پہلا جملہ ہے، "ہر بچہ کوئی نہ کوئی زبان بولتا ہے۔" بھلا بتایئے، یہ کون نہیں جانتا کہ "ہر بچہ کوئی نہ کوئی زبان بولتا ہے؟" حال میں میں نے انڈیا کی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے رسالے "اردو دنیا" کے ایک شمارے میں ایک ڈکشنری پر تبصرہ پڑھا۔ اس کے پہلے پیراگراف میں قاری کو بتایا گیا ہے کہ ڈکشنری کس چیز کو کہتے ہیں اور اس کا مصرف کیا ہے۔ تبصرہ نگار سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے مضمون کا پڑھنے والا نہیں جانتا کہ ڈکشنری کیا ہے اور اس کا مصرف کیا ہے؟

(5) اردو میں اپنے قصور کا صاف صاف اعتراف کرنا محاورے کے خلاف ہے۔ اگر کسی صاحب کے خط کا جواب دینے میں بہت دیر ہوگئی ہو تو میں لکھوں گا، "مجھے افسوس ہے کہ آپ کے خط کا جواب میں اس سے پہلے نہیں لکھ/دے سکا۔" حالانکہ میں لکھ سکتا تھا، اور ایمانداری کا تقاضا تھا، لیکن "میں نہیں لکھ/دے سکا" "نہیں،" "میں نے نہیں لکھا/دیا" لکھنا چاہیے، لیکن یہ اردو کا محاورہ نہیں۔

□□□

ابوبکر عباد

رالف رسل کی خودنوشت: جوئندہ یابندہ

ایک تاثراتی جائزہ

ہمارے اردو داں حضرات (بشمول شاعر وادیب، سوانح نگار اور مترجم وغیرہ) اکثر اصناف میں بے اعتدالیوں کا شکار ہوتے اور بیشتر اوقات قاری کو صحیح فن پارے کی قرأت سے محروم اور فن کے تئیں ابہام میں مبتلا کرتے رہے ہیں۔ اس کی واضح مثالیں حقیقت پسندی کے نام پر لکھے جانے والے بہت سے بے حقیقت اور غیر منطقی افسانوں، اور علامت نگاری اور تجریدیت کے شوق میں لکھی جانے والی لایعنی اور مبہم کہانیوں اور ان پر شائع ہونے والی تنقیدات کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ترجمے کے ضمن میں بھی بری چیزوں کے اچھے اور اچھی چیزوں کے برے تراجم اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں، یا بعض اوقات ترجمے کے نام پر تلخیص تحریف یا اصل سے مشابہ الفاظ کے مجموعے کو جس انداز سے پیش کیا گیا اس کی غیر سنجیدگی اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے، لیکن سب سے زیادہ افراط وتفریط کا جبر جس صنف کو برداشت کرنا پڑا وہ ہے سوانح یا خودنوشت سوانح حیات۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فکشن کی فرضی داستان کا فرضی کردار پچانوے فیصد کہانیوں میں سچ بولتا، دلیری سے حقائق کا سامنا کرتا اور اپنے خالق کی اطاعت سے انکار کرتا ہے، جب کہ سوانح میں زندگی کے حقائق پر مبنی واقعات کا حقیقی راوی اکثر کتابوں میں جھوٹ بولتا، اپنی انا کی اطاعت کرتا اور حقائق کی پردہ داری کرتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ سوانح نام ہے سچ بولنے اور واقعات کو جوں کا توں اس طور پیش کرنے کا کہ صاحب سوانح کی سیرت وشخصیت پوری طرح روشن ہو جائے۔

حالی نے جب 'حیات جاوید' کے نام سے سرسید احمد خاں کی سوانح لکھی تو علامہ شبلی نے اسے مدلل مداحی سے موسوم کیا، اور جب شبلی کی سوانح تحریر کی گئی تو ان کے عقیدت مندوں نے اسے کسی شریف آدمی کے بیڈ روم میں جھانکنے کے مترادف قرار دیا، جوش نے اپنی 'یادوں کی برات' میں عشق کے متعدد غلط واقعات سے قاری کو مرعوب کرنے اور اپنی انا کو تسکین دینے کی کوشش کی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر کردہ سوانح جب ان کے لواحقین نے کتر بیونت کے بعد شائع کی تو ہمہ جہت خوبیوں اور بشری خامیوں سے متصف انسان محض مفسر قرآن اور عالم دین بن کر نمودار ہوا۔

صورت حال یہ ہے کہ ہمارے یہاں خودنوشت سوانح نگار اپنے اور اپنے اسلاف کے، اور سوانح نگار حضرات اپنے یا اپنے ممدوح کے کارناموں کے ذکر میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے لگتے ہیں، اور ہر دو کو شریف النفس، معصوم اور متعدد اہم کارناموں کا حامل ثابت کرنے میں سارا زور قلم صرف کرنے اور دیانت کو بالائے طاق رکھنے کا ارتکاب کرتے ہیں۔ بیشتر سوانح میں ممدوح یا صاحب تصنیف باحیثیت، ذی علم اور اعلیٰ قدروں کے امین نظر آتے ہیں، وہ زندگی بھر مخرب اخلاق مشاغل سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر کبھی تقاضائے بشری سے مغلوب ہوئے بھی تو اس کے ذکر سے اجتناب کرتے ہیں۔ چنانچہ سوانح یا خود نوشت سوانح پڑھنے کے بعد بھی ہم صاحب سوانح کی شخصیت کے بیشتر پہلوؤں سے ناواقف رہتے ہیں۔ بعض خودنوشتوں میں صاحب سوانح کی شخصیت کے وہ وہ پہلو سامنے آتے ہیں کہ ان کے شناسا اور عزیز واقارب تو کیا خود صاحب سوانح کو بھی تازہ بنائے ہوئے بت کو پہچاننے میں قدرے مشکل پیش آتی ہے۔ وجہ غالباً خودنمائی کا شوق اور نرگسیت ہوتی ہوگی جو اپنے یا اپنے ممدوح کی زندگی کے تاریک گوشوں اور واضح عیوب کو بیان کرنے سے روکتی ہیں۔

انگریزی میں برٹرینڈ رسل اور اردو میں مرزا غالب اپنی سوانحی تحریروں اور خطوط میں اپنے متعلق بڑی بیباکی، سادگی اور صفائی سے وہ ساری باتیں بتا دیتے ہیں جنھیں دوسرے شاعر وادیب صیغۂ راز میں رکھنے کی حتی الامکان کوششیں کرتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل خود پر جان دینے والی ایک حاملہ محبوبہ کو چھوڑ دینے کی بات تک بلا جھجک بتا دیتے ہیں اور غالب کی 'ستم پیشہ' ڈومنی اور اس کی 'پرمیش بدمستی' سے سب واقف ہیں، اور ایک یہی واقعہ کیا، غالب نے اس نوع کی تحریروں میں اپنی تمام کمیوں، کمزوریوں اور (بقول اشرافیہ) کمینگی تک کو دیانتداری سے بیان کر دیا ہے۔

'جوئندہ یابندہ' غالب اور اردو کے ایک انگریز مداح رالف رسل کی خود نوشت سوانح حیات کی پہلی جلد کا اردو ترجمہ ہے، جس میں مصنف نے خود پر گزرنے والے تمام واقعات کو دیانت، سچائی اور کمال سادگی سے بیان کیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نہ تو اخلاقی قدروں میں

محصور ہے اور نہ اپنی امیج پر آنچ آنے کے بارے میں محتاط۔ یہ نہ تو اپنے عقیدے کا کٹر مقلد ہے اور نہ آئیڈیالوجی کا اندھا موکل۔ اسے اپنے اندر کے آدمی کو سرِ عام جوں کا توں پیش کرنے سے پرہیز نہیں۔ وہ انسانی خوبیوں اور خامیوں سے متصف ایک ایسا شخص ہے جو ایمانداری سے بچپن کی یادوں، لڑکپن کی باتوں، بلوغت کی منزل کے جنسی تلذذ کے احساسات، نوجوانی کی دوستی اور عشق کے واقعات اور ذہنی اور فکری رویوں کی بتدریج تبدیلیوں کو بڑے سچے طریقے سے بیان کرتا اور قاری کے سامنے اپنی شخصیت اور واقف کاروں کے خود سے متعلق پوشیدہ رازوں سے پردے اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ یوں جیسے جیسے مصنف کی زندگی کا سفر آگے بڑھتا ہے اس کی ذات اور شخصیت کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں، پڑھنے والوں کو وہ اپنی زندگی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا پورا موقع دیتا ہے، اور کتاب کے اختتام پر گویا وہ کہتا ہے لیجیے صاحب اب تک کی میری زندگی بھی اسی کتاب کی مانند کھلی ہے جسے آپ نے شوق سے پڑھا اور میرے بارے میں رائے قائم کی۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے بھی آپ سے نہ تو کچھ چھپایا، نہ ہی کسی جھوٹ کا سہارا لیا۔

درج بالا گفتگو سے اس مغالطے کا شکار نہ ہونا چاہیے کہ یہ کتاب صرف مصنف کی زندگی اور اس کے دوستوں اور شناساؤں کے انتہائی نجی معاملات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ رالف رسل کی نوجوانی کے دور میں یورپ پر دوسری جنگ عظیم کا خطرہ منڈلا رہا تھا اور عام لوگ اور خصوصاً باشعور لوگ سخت بے چینی کا شکار تھے۔ اسی دور میں رالف رسل برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے اور انسانی حقوق اور قدروں میں بے پناہ یقین نے انھیں محکوم قوموں، مظلوم لوگوں اور استحصالی نظام کے مطالعے کی طرف راغب کر دیا۔ وہ طالب علم کے طور پر اپنے اسکول اور بعد ازاں کالج میں بڑے جوش وخروش سے طلبہ تنظیم کے لیے کام کرتے تھے جس کا کام انسانی حقوق کے تئیں بیداری لانا اور جنگ مخالف محاذ تیار کرنا تھا۔ اس طرح رالف رسل کی داستان زندگی گویا انگلینڈ کے نوجوان ذہن اور جنگ کے بارے میں اس کے موقف کی بھی داستان ہے۔ فوج میں لازمی بھرتی کے بعد ایک افسر کے طور پر رالف رسل نے کئی برس ہندوستان کے شمال مشرقی علاقے میں، برما کی سرحد کے قریب گزارے اور برما سے ہو کر ہندوستان کی سرحد پر جاپانی حملے کی کوششوں کو بڑے قریب سے دیکھا اور جنگ کی ہولناکیوں کے اثرات بھی کوہیما میں خود دیکھے۔ انھوں نے ان تمام واقعات کا مشاہدہ ایک بیدار مغز اور سیاسی شعور کے حامل شخص کے طور پر کیا اور بڑے سلیقے سے انھیں اپنی سوانح میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے فوجی یونٹ کے ہندوستانی سپاہیوں میں سیاسی بیداری لانے کے لیے بڑا خطرہ مول لے کر مسلسل کام کیا اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو اس سے باخبر رکھا۔ ان کوششوں کی تفصیلات بھی بڑی دل چسپ ہیں۔ اس طرح ان کی سوانح عمری برصغیر ہندوپاک کی سیاسی، سماجی صورت حال، متعدد قد آور شخصیات، اور اہم واقعات اور تحریکوں کی کہانیاں بھی سناتی ہے۔ تاہم کتاب میں ایک کمی جو کھلتی ہے وہ ہے واقعات کی بہتات۔ اگر انتخاب سے کام لیا جاتا تو شاید یہ سوانح زیادہ جامع اور پراثر ہوتی لیکن اصول، سچ بولنے کے جنون، زندگی کے اتار چڑھاؤ اور مشاہدات کے شوق بیان نے مصنف کو ایسا نہ کرنے دیا۔

انگریزی میں لکھی اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر ارجمند آرا نے کیا ہے۔ ارجمند آرا انگریزی اور ہندی زبانوں سے اچھی واقفیت رکھتی ہیں اور دہلی یونیورسٹی میں اردو کی استاذ ہیں۔ زبان کے مسائل اور سماج و معاشرت کی صورت حال سے متعلق انگریزی میں مضامین لکھتی اور انگریزی سے اردو، اور اردو سے انگریزی میں ترجمے کرتی رہتی ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ بھی انھوں نے بڑی خوبی، خوبصورتی اور سنجیدگی سے کیا ہے۔ الفاظ کے دروبست، جملوں کی ساخت، محاوروں اور فقروں کے متبادل کے استعمال اور ربط وتسلسل کو قائم رکھنے میں انھوں نے اس سلیقے اور ہنرمندی سے کام لیا ہے کہ یہ کتاب انگریزی کے ترجمہ کی بجائے عمدہ اردو نثر کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔

سچی سوانح، اچھے ترجمے اور ایک عاشق اردو مستشرق کے حالات زندگی اور روداد جہد وعمل پڑھنے کے بعد بے اختیار دل چاہتا ہے کہ کاش اردو کے بھی کسی شاعر، ادیب، مصنف، دانشور یا اہم آدمی کی سوانح بھی ایسی ہی صداقت بیانی کے ساتھ، سلیس زبان اور شگفتہ انداز میں لکھی جاتی۔ جس میں 'جوئندہ یابندہ' کی طرح صاحب سوانح کے ظاہر وباطن کا حسن وقبح بیان بھی ہوتا، عزیز واقارب اور رفیقوں سے معاملات کا کھرا کھوٹا ذکر بھی ہوتا، معاصرین کے واقعی حالات بھی ہوتے اور اس عہد کے اہم رجحانات اور تاریخی واقعات بھی درج ہوتے۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu
Faculty of Arts,
University of Delhi
Delhi-110007

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
19	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
20	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
21	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
22	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
23	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
24	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
25	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
26	ابتدائی علم شہریت	47.00	12.00
27	انسانی ارتقا	70.00	18.00
28	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

850.00	3400.00	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔1-6)	29
448.00	1790.00	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔1-4 اور 6-8)	30
45.00	180.00	جنت سنگار	31
1018.00	4071	کلیات پریم چند (جلد 1 تا 24)	32
18.00	72.00	للّو لال جی ایک ادبی سوانح	33
97.00	387.00	لغت ابجد شاری (جلد۔1، حصہ دوم)	34
		لغت ابجد شاری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)	
67.00	268.00	مجموعہ نغز	35
32.00	126.00	مسدود راہیں	36
17.00	66.00	مثنوی بہرام وگل اندام	37
14.00	57.00	مولیئر	38
23.00	92.00	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	39
39.00	157.00	اڑیسہ میں اردو	40
15.00	60.00	پشکن	41
21.00	82.00	قدیم ہندی فلسفہ	42
21.00	82.00	قدیم ہندوستان میں شودر	43
19.00	76.00	قومی زبان	44
67.00	268.00	قواعد کیٹلاگ سازی	45
37.00	149.00	صنعتی تنظیم اور انتظام	46
42.00	167.00	سیر کہسار	47
21.00	82.00	طبیعیات کے بنیادی تصورات	48
34.00	135.00	تمل ناڈو میں اردو	49
40.00	158.00	تنقید عقل محض	50
11.00	43.00	تاریخ طبعی (جلد۔1)	51
24.00	97.00	تاریخ فلسفہ سیاسیات	52
17.00	66.00	تشریحی تصاویر	53
34.00	136.00	توضیحی لسانیات	54
108.00	431.00	تذکرہ مخطوطات (جلد۔1-5)	55
11.00	46.00	تالستائے	56
12.00	47.00	اصولِ معاشیات	57
30.00	120.00	اتر پردیش کے لوک گیت	58
30.00	118.00	وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت	59
11.00	45.00	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	60
663.00	2650.00	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 3-22)	61

62	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
63	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
64	عکس اور برعکس	128.00	32.00
65	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
66	بھارت 2004	250.00	63.00
67	دھوپ چولھا	38.00	10.00
68	اجارہ	131.00	33.00
69	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 4	1163.00	291.00
70	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
71	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
72	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
73	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
74	ارتقائے کائنات انسان ودیگر مضامین	94.00	24.00
75	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
76	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
77	کائنات جلیل	80.00	20.00
78	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
79	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
80	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
81	پیمائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
82	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
83	قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی	98.00	25.00
84	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
85	شہیدان آزادی (جلد اول ودوم)	213.00	53.00
86	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
87	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
88	سخنوران گجرات	77.00	19.00
89	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
90	تاریخ آصفی	58.00	15.00
91	اجرتیں	95.00	24.00
92	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	178.00	45.00
93	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2009 تک دی جائے گی۔

نوٹ: محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ریحان غنی

ڈاکٹر سید محمود

بہار شروع سے ہی مردم خیز سرزمین رہی ہے۔ یہاں مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے آفتاب و مہتاب بن کر پوری دنیا کو منور کیا اور علم و آگہی کی روشنی پھیلائی۔ ان میں ڈاکٹر سید محمود بھی تھے۔ سیاست کے شعبے اور ملک کی تعمیر نو میں ان کی خدمات کئی دہائیوں پر محیط ہیں۔ انھوں نے ہی پٹنہ میں گورنمنٹ اردو لائبریری قائم کی۔ یہ 1938 کی بات ہے۔ اس وقت وہ وزیر تعلیم تھے۔ یہ بہار کی واحد سرکاری اردو لائبریری ہے۔ اس وقت اس کے لائبریرین حسن احمد صاحب ہیں۔ رسالہ ''ندیم'' بہار نمبر 1940 میں شاہ قاسم غنی نے اپنے مضمون ''صوبہ' بہار کا ایک دلکش اجمالی مرقع'' میں لکھا ہے کہ:

''گذشتہ سال آنریبل ڈاکٹر سید محمد سابق وزیر تعلیم صوبۂ بہار نے گورنمنٹ اردو لائبریری، حکومت کی طرف سے قائم کی ہے۔ یہ اردو کی خدمت کے لیے ان کا اہم کارنامہ ہے۔ اس لائبریری کے لیے اورینٹل لائبریری کے بغل میں لا کالج کی پرانی عمارت اس کو دے دی گئی تھی۔ مولوی سید حسن آرزو اس کے پہلے لائبریرین تھے۔''

اس سلسلے میں شاہ محمد عثمانی اپنی کتاب ''ٹوٹے ہوئے تارے'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر صاحب (سید محمود) کی اسکیم تھی کہ بہار کے ہر ضلع میں ایک اچھی لائبریری قائم کریں۔ لیکن مسلم لیگیوں نے ڈاکٹر صاحب کی ہر جگہ مخالفت کی کیوں کہ وہ کانگریس میں تھے۔ نتیجے کے طور پر ان کے ہاتھ کمزور پڑ گئے اور وہ اتنے بے اثر ہوگئے کہ وہ اپنی اسکیم کو کامیاب نہ بنا سکے اور صرف پٹنہ میں گورنمنٹ اردو لائبریری بن کر رہ گئی۔'' (صفحہ 178)

ڈاکٹر سید محمود 1889 میں اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے قدیم مردم خیز قصبے سید پور بھتری میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا کا نام قاضی سید فرزند علی اور والد کا نام ملا سید محمد عمر تھا۔ فرزند علی علاقے کے ممتاز ذی اثر رئیس تھے اور والد علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے تھے۔ علی گڑھ میں سید محمود کے قیام کے دوران ایک دور ایسا بھی آیا جب انگریزوں سے مرعوبیت بڑھ رہی تھی۔ کالج کے طلبہ میں کچھ حساس طبیعت والوں کو یہ ناگوار گزرا۔ ان میں ڈاکٹر سید محمود بھی تھے۔ انھوں نے چار ساتھیوں عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خاں شروانی، عبدالمجید بیرسٹر اور قاضی تلمذ حسین کے ساتھ مل کر ذہنی مرعوبیت دور کرنے کے لیے ایک خفیہ انجمن کی بنا ڈالی۔ اس کی سرگرمیاں بڑھیں اور کالج میں طلبہ کے دو گروپ بن گئے۔ ایک حکومت کا باغی اور دوسرا حکومت پرست۔ اس خفیہ سوسائٹی میں انگریزوں کے خلاف مضامین پڑھے جاتے اور مباحثے ہوتے۔ ڈاکٹر سید محمود 1900 سے 1907 تک علی گڑھ میں رہے۔ اس سات سال کے عرصے میں وہ انگریزوں کے دشمن بن چکے تھے اور انگریز کو ہندوستان کے لیے ایک عذاب سمجھنے لگے تھے۔ پھر اس کے بعد ڈاکٹر سید محمود انگریز مخالف دل و دماغ لیے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد 1911 میں جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ سرعلی امام کے اصرار پر وہ پریکٹس کرنے کے لیے 1913 میں پٹنہ چلے آئے اور سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس دوران مولانا ضیاء الحق سے ان کے روابط ہوئے۔ 1915 میں چھپرہ میں مولانا مظہر الحق کی صاحبزادی سے ڈاکٹر سید محمود کی شادی ہوگئی۔ لیکن ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی میں تحریر ہے کہ مولانا مظہر الحق کی بھانجی رفیق الفاطمہ سے ان کی شادی ہوئی جن سے 3 لڑکے اور 3 لڑکیاں ہوئیں۔ اس طرح بہار سے ان کا رشتہ اور بھی مضبوط ہوگیا۔ پٹنہ ہائی کورٹ میں ڈاکٹر سید محمود کی وکالت کا زمانہ 1913 سے 1921 تک رہا۔ آٹھ برسوں کے دوران ان کا شمار پٹنہ ہائی کورٹ کے ممتاز بیرسٹروں اور ریاست کے مدبر رہنماؤں میں ہونے لگا۔ 1913 میں کانپور مسجد مقدمے میں انھوں نے مولانا مظہر الحق کی معاونت کی۔ ڈاکٹر سید محمود 1910 سے ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ 1921 میں وہ ممبئی چلے گئے اور وکالت چھوڑ کر خلافت تحریک میں سرگرم ہوگئے۔ انھوں نے خلافت اور انگلینڈ نام کی کتاب لکھی جس میں 19 ویں صدی کے اواخر میں خلافت اور اینگلو ترکش تعلقات کا تاریخی جائزہ پیش کیا۔ 1923 میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے اور ملک و قوم کی کافی خدمت انجام دی۔ جیل گئے اور ایثار و قربانی کے نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے۔ اس عہدے پر وہ تقریباً دو برس فائز رہے۔ اس کے بعد دوبارہ وکالت شروع کر دی۔ 1929 میں انھیں دوبارہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جنرل سکریٹری بنا دیا گیا۔ وہ اس عہدے پر 1936 تک یعنی مسلسل سات برس تک فائز رہے۔ اس دوران ڈاکٹر سید محمود نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی غیر قانونی

جماعت تھی اور اس کی خبروں کو چھاپنا قانوناً ممنوع تھا، اس دور میں ڈاکٹر سید محمود نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے "خفیہ ممبر سسٹم" قائم کیا جس نے کانگریس تحریک کو آگے بڑھایا۔

بہار میں 22 تا 27 جنوری 1937 کو اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن میں کانگریس کو غیر معمولی کامیابی ملی۔ اس وقت ریاست میں 129 اسمبلی حلقے تھے۔ ان میں 70 عام حلقے اور 40 مسلمانوں کے لیے ریزرو تھے ان میں کانگریس کے 6، یونائٹڈ پارٹی کے 12، انڈیپنڈنٹ پارٹی کے 18، احرار پارٹی کے 3، اور ایک خاتون امیدوار کامیاب ہوئیں۔ اس انتخاب میں ڈاکٹر سید محمود شمالی چمپارن حلقے سے کامیاب ہوئے تھے۔ 24 مارچ کو شری کرشن سنگھ کو گورنر کی طرف سے حکومت سازی کی دعوت ملی۔ کانگریس نے 17-18 مارچ 1936 کو نئی دہلی میں اپنی میٹنگ میں کیے گئے فیصلے کے مطابق گورنر سے یہ یقین دہانی کرانے کو کہا کہ وہ اپنے اختیارات خصوصی کا استعمال اور وزیروں کے مشوروں کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ گورنر نے اس طرح کی یقین دہانی کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے سری کرشن بابو نے حکومت سازی سے معذوری ظاہر کی۔ اس کے بعد گورنر نے دوسری سب سے بڑی پارٹی کے رہنما مسٹر محمد یونس کو حکومت بنانے کی دعوت دی اور انھوں نے وزیر اعظم کے عہدے کا حلف لیا۔ ان کی حکومت صرف چار پانچ مہینے رہی۔ 20 جولائی کو سری کرشن سنگھ کی قیادت میں پہلی کانگریس حکومت کی تشکیل ہوئی۔ ڈاکٹر سید محمود کو بھی وزارت میں شامل کیا گیا اور انھیں تعلیم، صنعت اور تعلیم بالغاں کا محکمہ دیا گیا۔ انھوں نے اپنے دور وزارت میں پورے انہماک سے ملک و قوم کی خدمت کی۔ انھوں نے پرائمری تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور اس کی ترقی کے لیے کئی اسکیمیں بنائیں جن کے تحت اسکول کھولے گئے اور تعلیمی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے ہی ڈاکٹر سید محمود نے ہر ضلع میں ایک اچھی لائبریری قائم کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن وہ صرف پٹنہ میں ہی اردو لائبریری قائم کر سکے۔ بتایا جاتا ہے کہ ہندوستانی زبان کے مسئلے میں بھی ڈاکٹر سید محمود کی بدولت ہی بہار نے پورے ہندوستان کی رہنمائی کی اور جب ہندو پریس نے ہندوستانی زبان کی تحریک کی مخالفت شروع کی تو ڈاکٹر سید محمود نے پنڈت جواہر لال نہرو کو زبان کے متعلق اپنا تاریخی مکتوب بھیجا جس کا مفصل جواب پنڈت نہرو نے اخبارات میں شائع کرایا۔ ڈاکٹر سید محمود نے زرعی شعبے کی ترقی اور تعلیم بالغاں کی طرف بھی خصوصی توجہ دی اور عوام الناس کے لیے خواندگی پروگرام نافذ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے ماتحت محکموں کو ترقی دینے کے علاوہ کچھ ایسے مسائل پر بھی توجہ دی جن کا تعلق ریاست کے مسلمانوں سے تھا۔ ان مسائل میں ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے رزرویشن اور لوکل بورڈ میں مسلمانوں کی قیادت کے مسئلے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے کے اخبارات میں آیا تھا کہ ان مسائل میں دیگر وزراء سے ان کی رسہ کشی بھی ہوئی لیکن ڈاکٹر صاحب مضبوطی سے اپنے مطالبے پر قائم رہے اور ملازمتوں میں تناسب کے مسئلے کو حل کرایا۔

ڈاکٹر سید محمود پہلے دو عام انتخابات 1952 اور 1957 میں لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور 1952 اور 1957 تک امور خارجہ کے وزیر مملکت بھی رہے۔ اس دوران انھوں نے مغربی ایشیا کے کئی ممالک کا دورہ کیا۔ 1964 میں سنگین فسادات کے بعد انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے الگ سے ایک تنظیم کی ضرورت محسوس کی۔ ان کی کوششوں سے ہی ایک غیر سیاسی تنظیم "آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت" قائم کی گئی۔ 1967 کے عام انتخابات میں مجلس مشاورت کی یو پی شاخ نے کانگریس مخالف رویہ اختیار کیا اور انتخابات میں مجلس کی شمولیت کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے اس کی مخالفت کی اور نظریاتی اختلافات کی وجہ سے انھوں نے اس سے علاحدگی اختیار کر لی۔ ڈاکٹر سید محمود نے بہار کی ترقی کے لیے بھی کئی پروگرام بنائے اور ملیٹری ٹریننگ کے لیے ریاست میں ایک اسکول کے قیام کی بھی کوشش کی۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ آخر میں انھوں نے چھپرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا انتقال 1971 میں ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے گورنمنٹ اردو لائبریری کو ڈاکٹر سید محمود کے نام سے منسوب کیا جائے، ان کا یوم پیدائش سرکاری طور پر منایا جائے اور بہار کے محکمۂ راج بھاشا کی طرف سے ان کے نام سے بھی ایک ایوارڈ جاری کیا جائے۔

□□□

پتہ:
C/o Hakeem Alimuddin Balkhi
Main Road Alam Gnaj, Patna-800007

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

حبیب احمد

حبیب تنویر — ایک زندہ داستان

حبیب تنویر کے والد (حافظ) محمد حیات خاں صوات (پشاور) کے باشندے تھے۔ وہ اپنے والد حبیب اللہ خاں کے ساتھ انیسویں صدی کے آخر میں ترک سکونت کرکے شہر بہ شہر ہوتے ہوئے رائے پور پہنچے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔

حافظ محمد حیات خاں کی چار لڑکیاں اور تین لڑکے حمید احمد خاں، ظہیر احمد خاں، اور حبیب احمد خاں تھے۔ حبیب احمد خاں دونوں بھائیوں سے چھوٹے ہیں۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں بے شمار خاندان صبح نو کی امید لیے ہجرت کر رہے تھے لیکن حبیب تنویر نے اپنے والد اور اعزہ کے اصرار کے باوجود اپنا وطن چھوڑنا گوارا نہیں کیا، انھوں نے یہیں رہتے ہوئے اپنی دنیا آپ تعمیر کی، اور ایک زندہ داستان بن گئے۔

حبیب احمد خاں، جو حبیب تنویر کے نام سے مشہور ہوئے، یکم ستمبر 1923 کو رائے پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر اور مدرسے میں ہوئی۔ اسکول کی تعلیم کے لیے 1933 میں لاری میونسپل ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں سے انھوں نے 1940 میں میٹرک پاس کیا، 1944 میں مارس کالج ناگپور سے بی اے کیا۔ 1945 میں اردو میں ایم اے کرنے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچے۔

علی گڑھ کی فضائیں مجاز کی ''آوارہ'' جاں نثار اختر کی ''لاری'' اور اختر انصاری کے قطعات سے گونج رہی تھیں۔ حبیب تنویر اطہر پرویز اور عزیز حامد مدنی مثل یار غار بن گئے، جن کا کلاس میں کم کیمپس میں زیادہ وقت گزرتا۔ امتحان آئے تو حبیب تنویر فہرست سے اپنا نام غائب پاکر رشید احمد صدیقی کے پاس گئے۔ انھوں نے رجسٹر حاضری طلب کیا۔ ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا! ''حضور! احمق کہلانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ بھئی دو چار پرسینٹ کی کمی ہوتی تو ضرور اس پر غور کرتا، آپ تو یہاں سے وہاں تک غائب نظر آرہے ہیں۔'' قائل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر ممبئی کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔

ممبئی میں ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نکھرنے کے مواقع ملے۔ انھی دنوں NAVY کے لیے افسران کی ضرورت کا اشتہار دیکھ کر درخواست دے دی کہ دنیا کی سیر کرنے کا موقع ملے گا لیکن امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ تلاش معاش میں ممبئی کی پُر پیچ راہوں پر بھٹکنا گویا حبیب تنویر کا مقدر سا بن گیا تھا اسی اثنا میں فلم ڈائرکٹر سوریم سے ملاقات ہوئی۔ مقدر نے کروٹ لی اور حبیب تنویر فلم ''آپ کے لیے'' میں بحیثیت ہیرو منتخب ہوگئے۔ فلم پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی لیکن ڈائرکٹر اور پروڈیوسر کے درمیان ایک قضیے کی وجہ سے ریلیز نہیں ہوسکی۔ حبیب تنویر پھر تلاش روزگار میں سرگرداں ہوگئے۔ ایک دن ان کی ملاقات یوپی کے ایک تاجر محمد طاہر سے ہوئی۔ محمد طاہر نے انھیں اپنی بارود کے ڈبوں کی فیکٹری میں بحیثیت سپروائزر ملازمت کی پیش کش کی جو حبیب تنویر نے قبول کرلی۔ اسی دوران اتفاقاً ایک ہوٹل میں ان کی ملاقات ذوالفقار اور بخاری سے ہوئی۔ بخاری صاحب حبیب تنویر کے والد کے ہم وطن یعنی پشاوری تھے۔ بخاری صاحب نے ان کی آواز، لہجہ اور شائستگی دیکھتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو ممبئی میں لے لیا اور انھیں بچوں اور خواتین کے پروگرام سے لے کر ڈرامے، فیچر، فلم ریویو کی ذمے داری سونپ دی۔

ریڈیو کی ملازمت حبیب تنویر کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اس ملازمت کے دوران ان کی ملاقاتیں بہت سی اہم شخصیات سے ہوئیں۔ ای ایم فاسٹر، آبرے منین، سید محمود، یگانہ چنگیزی، سعادت حسن منٹو اور بابوراؤ پٹیل وغیرہ۔ بابوراؤ پٹیل نے انھیں اپنے انگریزی ماہنامے ''فلم انڈیا'' کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بننے کی پیشکش کی جو حبیب تنویر نے بخوشی قبول کرلی۔ یہ ان کے لیے صحافت کا پہلا زینہ تھا۔ بعد میں سہ ماہی ''ٹیکسٹائل جرنل'' ممبئی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1948 سے 1950 تک ہفت روزہ فلمی اخبار ''باکس آفس'' ممبئی کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے۔ اس عرصے میں حبیب تنویر کو صحافت کے رموز و نکات، اصول و آداب سے بخوبی واقفیت حاصل ہوئی۔

اداکاری کا شوق جو انھیں ممبئی کھینچ لایا تھا۔ بالآخر رنگ لایا۔ انھوں نے 1950 سے 1953 کے درمیان بابو راؤ پائی کی فیمس پکچرز کے لیے ایڈورٹائزنگ شارٹس بنائے اور آٹھ فیچر فلموں میں اداکاری کی اور نغمے اور مکالمے بھی لکھے۔

ممبئی میں 1945 سے 1954 تک اپنے قیام کے دوران وہ اداکار و ہدایت کار کی حیثیت سے اپٹا سے بھی وابستہ رہے۔ اپنے تجربے اور مہارت کی بنیاد پر 1954 میں انھوں نے دہلی میں پروفیشنل تھیٹر ''ہندوستانی تھیٹر'' کی بنیاد رکھی۔ 1955 میں اس فن کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ''رائل اکادمی آف ڈراماٹک آرٹس'' اور ''برسٹل اولڈ وِک تھیٹر اسکول'' وغیرہ میں تین سال تک تھیٹروں کا مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ واپس آنے پر 1958 میں پہلے ہندوستانی

تھیٹر کے لیے ڈراما ''مٹی کی گاڑی'' پیش کیا اور 1959 میں انھوں نے نجی طور پر اپنا ''نیا تھیٹر'' دہلی میں شروع کیا۔ اس تھیٹر سے ابھی تک تیس ڈرامے اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔ سب سے پہلا ڈراما ''سات پیسے'' 1959 میں اسٹیج کیا گیا تھا۔

حبیب تنویر ڈراما کے اس طویل سفر 1948 سے 2008 تک یعنی 60 سال میں 72 ڈرامے اسٹیج کر چکے ہیں۔ ان میں اردو کے 18، ہندی کے 18، چھتیس گڑھی کے 23، انگلش کے 8، ہندوستانی کے 2، ہریانوی کے 2 اور اڑیا کے 2 ڈرامے شامل ہیں۔

حبیب تنویر نے 72 ڈراموں میں سے 52 ڈرامے ڈائریکٹ کیے۔ ان 72 اسٹیج شدہ ڈراموں میں سے 25 ڈرامے حبیب تنویر کے طبع زاد ہیں۔ ان 25 ڈراموں میں دس ڈرامے اردو میں، سات ڈرامے ہندی میں، سات ڈرامے چھتیس گڑھی میں اور ایک ڈراما انگریزی میں ہے، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

اردو ڈرامے	اسٹیج کیے جانے کا سال	نوعیت
1. آگرہ بازار	1954	طبع زاد، دہلی
2. دودھ کا گلاس	1954	طبع زاد، دہلی
3. چاندی کا چمچہ	1954	طبع زاد، دہلی
4. ہر موسم کا کھیل	1954	طبع زاد، دہلی
5. آگ کی گیند	1954	طبع زاد، دہلی
6. گدھے	1954	طبع زاد، دہلی
7. کارتوس	1954	طبع زاد، دہلی
8. راجیہ چمپا اور چار بھائی	1961	طبع زاد، دہلی
9. دیکھ رہے ہیں نین	1992	طبع زاد، دہلی
10. ایک عورت ہیپشیا بھی تھی	1999	طبع زاد، دہلی
ہندی ڈرامے		
1. شانتی دوت کامگار	1953	طبع زاد، نکّو ناٹک، ممبئی
2. پرم پرا	1954	طبع زاد، نکّو ناٹک، ممبئی
3. کشتیا کی چپراسی	1940	طبع زاد، نکّو ناٹک، ممبئی
4. سوتر دھار	1964	طبع زاد، نکّو ناٹک، ممبئی
5. ہرما کی امر کہانی	1985	طبع زاد، نکّو ناٹک، ممبئی
6. کیس نمبر 432	1990	طبع زاد، نکّو ناٹک، ممبئی
7. ڈیڑی کا گھر	1995	طبع زاد، نکّو ناٹک، ممبئی
چھتیس گڑھی میں لکھے ہوئے ڈرامے		
1. اندر لوک سبھا	1971	طبع زاد، نکّو ناٹک، دہلی
2. گاؤں کا نام سسرال	1973	طبع زاد، نکّو ناٹک رائے پور
3. بہادر کلارن	1978	طبع زاد، نکّو ناٹک، دہلی
4. سون ساگر	1981	طبع زاد، نکّو ناٹک، دہلی
5. منگلو دیدی	1984	طبع زاد، نکّو ناٹک جانجگیر، بلاسپور، چھتیس گڑھ
6. سڑک	1994	طبع زاد، نکّو ناٹک پینڈرا روڈ، بلاسپور، چھتیس گڑھ
7. سن بہری	2000	طبع زاد، نکّو ناٹک، رائے پور
انگریزی ڈرامے		
A Broken Bridage-1	1995	طبع زاد، شکاگو، یو۔ایس۔اے۔

73 ڈرامے جو پانچ ڈرامے کہانیوں سے ماخوذ ہیں ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

عنوان کہانی	مصنف	نوعیت
1. شطرنج کے مہرے	پریم چند	اردو
2. خودکشی	دوستووسکی	اردو، ایکانکی
3. سات پیسے	دوستووسکی	چیک کہانی، اردو
4. ٹھاکر پرتھپال سنگھ	وجے دان دیتھا	ہریانوی
5. چرن داس چور	وجے دان دیتھا	چھتیس گڑھی
6. دیوی کا وردان	وجے دان دیتھا	چھتیس گڑھی
7. موٹے رام کا ستیہ گرہ	پریم چند	ہندوستانی

یہ کہانی صفدر ہاشمی اور حبیب تنویر نے مشترکہ طور پر ڈراماٹائز کی ہے۔

73 ڈراموں میں 10 ڈرامے ترجمے شدہ ہیں۔ ان میں پانچ ڈرامے حبیب تنویر کے ترجمہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

عنوان ڈراما	مصنف	زبان
1. تمباکو کے نقصانات	انتون چیخوف	اردو
2. مٹی کی گاڑی	شدرک	ہندی
3. شاجاپور کی شانتی بائی	برتولت بریخت	ہندوستانی
4. کامدیو کا اپنا بسنت رتو کا سپنا	ولیم شیکسپیئر	اردو، چھتیس گڑھی
5. زہریلی ہوا	راہل ورما	ہندوستانی

یہ ڈرامے ہندوستان کی مختلف تھیٹریکل کمپنیوں اپٹا، ممبئی، جے جے اسکول آف آرٹس، ممبئی، جامعہ ڈراما سوسائٹی، دہلی، ہندوستانی تھیٹر، دہلی، جن ناٹیہ منچ دہلی، این ایس ڈی ریپرٹری، دہلی، شکاگو انسامبل، امریکا، اڑیسہ ورک شاپ، برہما پور، اڑیسہ، آئی ٹی آئی نئی دہلی اور جانجگیر لوک ورک شاپ بلاسپور

کے تحت پہلی بار ممبئی، حیدرآباد، نئی دہلی، فرید آباد فورٹ، علی گڑھ، بھکموی، میسور، جودھپور، ہریانہ، اڑیسہ، رائے پور، مہاسمند، بلاسپور، درگ، امریکا، اجین اور بھوپال میں کھیلے گئے۔

حبیب تنویر کو بھی ڈراموں میں خواہ انھوں نے ہدایت کے فرائض انجام دیے ہوں، ان کے طبع زاد ڈرامے ہوں یا ترجمے کیے ہوں، اڈاپٹ کیے ہوں، یا ان میں اداکاری بھی کی ہو، خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ان کے مشہور ڈراموں میں گاؤں کا نام سسرال، بہادر کلارن، دیکھ رہے ہیں نین، بسنت رتو کا سپنا، اتر رام چرتر، مدرا راکھشس، ہرما کی امر کہانی، ساجا پور کی شانتی بائی، شطرنج کے مہرے، میرے بعد، مٹی کی گاڑی، چرن داس چور اور آگرہ بازار ہیں۔ ان میں آخرالذکر تین ڈرامے مشہور ترین ہیں۔ بقول حبیب تنویر:

''یہ تین ڈرامے یعنی آگرہ بازار، مٹی کی گاڑی اور چرن داس چور اسی ترتیب سے میرے رنگ کرم کے سفر میں سنگ میل ہیں۔ یہی تین ناٹک ہیں جو کمبل کی طرح مجھ سے چپک کر رہ گئے اور بار بار کی فرمائشوں نے انھیں سدا بہار بنا دیا..... جنھیں آلوچکوں نے اکثر جھنجھوڑا لیکن عوام میں ان کی مقبولیت کم نہ ہوئی بلکہ بڑھتی ہی گئی۔ یہی تین ایسے ناٹک بھی ہیں جنھوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے مجھے وہ شیلی دی جس نے ایک لحاظ سے بعد کے سارے پروڈکشنوں میں میرے دستخط کی صورت اختیار کر لی۔''

(ہفت روزہ ادب نامہ (ندیم بھوپال) 26 ستمبر 2004)

حبیب تنویر کے ڈراموں کا خمیر روایت اور عوامیت سے اٹھا ہے۔ ایک ایسی عوامیت جو تعمیم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا مقصد قطعی یہ نہیں ہے کہ وہ جدیدیت کے منکر ہیں۔ ان کے یہاں روایت اور عوامیت میں جدیدیت سے اکتساب حسب موقع اور بقدر ضرورت نظر آتا ہے۔ 1973 میں رائے پور میں منعقدہ ''ناچا ورک شاپ'' میں عوامی اداکاروں کی تربیت، ان کی روایت پسندی کا عملی مظاہرہ ہے۔ ہر چند کہ انھوں نے یورپ میں قیام کے دوران ڈرامے سے متعلق جدید نظریات اور تکنیک کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ اسی زمانے میں برتولت بریخت کے متعدد ڈرامے دیکھے اور بریخت کے ساتھ کام کرنے والوں سے بالمشافہ ملاقات میں تبادلۂ خیال بھی کیا۔ باوجود اس کے انھیں اپنی ہی سرزمیں سے اُبھی روایات معتبر نظر آئیں۔ ان کے معرکتہ الآرا ڈرامے اسی روایت اور عوامیت پسندی کی دین ہیں۔ اس موقع پر ''آگرہ بازار'' کا ذکر قدرے تفصیل سے کرنا نامناسب نہ ہوگا، اس مشہور عالم ڈرامے کی بنیاد کسی غور و فکر کے نتیجے میں نہیں رکھی گئی تھی، اسے محض حسن اتفاق سمجھیے کہ حبیب تنویر دہلی میں ڈراما نگاری کی طرف مائل ہو گئے تھے اور بچوں کے لیے ڈرامے لکھ کر انھیں اسٹیج کرانے کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ ان کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک پرانے ہم جماعت اطہر پرویز (مرحوم) نے مشورہ دیا کہ یوم نظیر قریب ہے اس پر ڈراما لکھو۔ چنانچہ انھوں نے نظیر اکبرآبادی کی تخلیقات پر مبنی ڈراما ''آگرہ بازار'' لکھا۔ اس میں شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کو بھی ڈرامے کا لازمی جز بنایا گیا ہے۔ یہ ڈراما پہلی بار 1954 میں جامعہ ملیہ میں کھیلا گیا تھا اور پچاس منٹ میں مکمل ہو گیا تھا۔ آگرہ بازار میں کام کرنے کے لیے پیشہ ور اداکار بھی نہیں تھے، جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے حصہ لیا تھا۔ انھی طلبہ میں سے ایک طالب علم اشفاق محمد خاں ہیں جو کچھ عرصہ پہلے تک JNU کے شعبۂ اردو سے عارضی طور پر وابستہ تھے۔ بقید حیات ہیں۔ جامعہ کے کھلے منچ پر ریہرسل کی جاتی تھی۔ پھر جب رام لیلا گراؤنڈ کے اسٹیج پر یہ ڈراما پیش کیا گیا تو اس میں پان والے کے رول میں جامعہ کا اصلی پان والا اور درزی کے رول میں اصلی درزی تھا۔ کمہار کی دکان پر جو ایک گدھا کھڑا کیا گیا تھا اس کی شروع سے اخیر تک اسٹیج پر خاموش موجودگی نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ اتفاق سے گدھے نے اسٹیج ہی پر لید کر دی جس نے بقول حبیب تنویر رنگ کے ساتھ بو کی کمی بھی پوری کر دی۔ اس ڈرامے میں ایسے مناظر دکھائے گئے جو ناظرین کے لیے بالکل نئے تھے۔ نظیر نے عام انسان کی دلچسپیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جائے واقعات کو کسی تنگ و تاریک مکان میں نہیں بلکہ شور و غل سے بھرے بازار میں دکھایا گیا ہے۔

بلاشبہ آگرہ بازار حبیب تنویر کا شاہ کار ہے۔ یہ ڈراما (آگرہ بازار) کتابی شکل میں ایک مدت سے نایاب تھا۔ پہلی بار 1954 میں آزاد کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا تھا۔ 1998 میں ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب ''اردو ڈراموں کا انتخاب'' میں آگرہ بازار کو بھی شامل کیا ہے۔ محمد حسن نے 1954 کے ایڈیشن ہی کو جیسا کا تیسا دہرا دیا۔ حالانکہ اس درمیان 1970 اور 1992 میں دو ایڈیشن ہندی میں ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں اردو کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ اس میں نظموں کے انتخاب میں نظر ثانی کے ساتھ ساتھ جو مزید تین کردار بڑھائے گئے تھے وہ بھی ہیں۔ علاوہ ازیں نظیر اکبرآبادی کے کلام پر تبصرہ بھی شامل ہے۔ نظیر کو اردو نظم کا باوا آدم قرار دیتے ہوئے حبیب تنویر رقم طراز ہیں:

''نظیر سے پہلے اردو میں غزل، قطعہ، ہجو، قصیدہ، مثلث، مخمس، مسدس، مثنوی، نعت، مرثیہ یہ سب اصناف تو موجود تھیں لیکن جسے نظم کہیں ویسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس لحاظ سے نظیر اردو نظم کے باوا آدم ہیں۔ یعنی وہ صنف جسے بعد میں اقبال، جوش اور ان کے بعد اردو کے نئی نسل کے نئے شاعروں نے نکھارا۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے ایسے ایسے مضمون نظیر نے اپنی نظموں میں قلمبند کیے ہیں جن کی طرف کبھی کسی شاعر کی نظر بھی نہ گئی۔ نہ نظیر سے پہلے نہ نظیر کے

بعد۔ اور اگر نظر جاتی تو نظیر کی نظموں کے موضوعات پر قلم اٹھانا آسان بھی نہ تھا۔ نظیر کے یہاں شعر کا دریا تھا جو بے ساختہ بہے جا رہا تھا۔ ورنہ ککڑی، برتن، تربوز، لڈو جیسے مضامین پر اس کمال کی خیال آرائی کہاں ممکن تھی۔"

حبیب تنویر شاعر بھی ہیں۔ صحیح کہا جائے تو وہ شاعری کی راہ سے ڈرامے کی طرف آئے تھے۔ شعروسخن سے دلچسپی انھیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کے بڑے بھائی ظہیر احمد خاں شعر کہتے تھے اور وحشی تخلص کرتے تھے۔ میلادخوانی سے ان کی والدہ میں شاعری سے شغف پیدا ہو گیا تھا۔ ماموں عبدالرؤف خاں باقاعدہ شاعری کرتے تھے، محوی تخلص تھا۔ حبیب تنویر کے سن شعور کو پہنچنے تک رائے پور اور اطراف میں ترقی پسند شعرا کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ سردار جعفری، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، فیض اور مخدوم کا کلام اکثر ریڈیو سے نشر ہوتا تھا، جسے حبیب تنویر اور ان کے ہم ذوق بڑی پابندی سے سنتے تھے، بیشتر کلام ازبر ہو گیا تھا۔ اردو زبان و ادب کا مرکز نہ ہوتے ہوئے بھی شاعری وہاں کی فضا میں رچی بسی تھی۔ چنانچہ وہ بھی ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے اور رفتہ رفتہ شعرگوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ ابتدا میں اگرچہ اپنے بزرگوں کو کلام دکھانے سے گریز کرتے رہے لیکن بعد میں جب کلام میں پختگی اور اعتماد پیدا ہو گیا تو انھوں نے اپنے ماموں عبدالرؤف خاں محوی کو کلام دکھایا جسے انھوں نے سراہا۔

کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے ایک گیت "نیل کمل کیا جانے" لکھا اور اسے "ادب لطیف" میں جو لاہور سے احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں نکلتا تھا، بھیج دیا جو چھپ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس گیت کے چھپنے سے خود اعتمادی میں زبردست اضافہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی۔ ممبئی پہنچنے کے بعد انھوں نے سردار جعفری کی معیت میں باقاعدہ مشاعرے پڑھنے شروع کر دیے۔ وہ مشاعروں میں ترنم سے اپنا کلام سناتے تھے۔ انھوں نے ہر دو اصناف غزل اور نظم پر طبع آزمائی کی ہے۔ پابند کے ساتھ آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی شاعری ترقی پسندی کے سائے میں پروان چڑھی ہے۔

ڈرامے سے کُل وقتی وابستگی کی وجہ سے ان کی سخن آرائی جاری تو رہی لیکن کم کم، اور ان کے کلام کا کوئی مجموعہ سامنے نہیں آسکا۔ گاہے گاہے رسائل میں ان کی تخلیق نظر آجاتی ہے۔ اردو زبان اور اسٹیج کے مستقبل کو لے کر تشویش کا اکثر اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ حبیب تنویر زبان کے معاملے میں متعصب ہیں نہ اس کے مستقبل سے مایوس۔ انھوں نے اردو، ہندی، چھتیس گڑھی انگریزی کے علاوہ ہریانوی اور اڑیا زبان میں ڈرامے اسٹیج کیے ہیں جو ان کے شفاف ذہن کے آئینہ دار ہیں۔

اردو زبان میں اردو تھیٹر کے مستقبل کے بارے میں ان کی فکر واضح ہے۔ انیس اعظمی کے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ:

"مجھے فی الحال اردو اسٹیج ختم ہوتا نظر نہیں آ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اردو دبنے کے باوجود اور زور سے پنپ رہی ہے اور پھیل رہی ہے۔ اگر اس طرح کی کوششیں جاری ہیں اور ذرا سی سرکاری مدد مل گئی، سرکاری جو لسانی پالیسی ہے اس کے بل پر ملازمتیں ملنے لگیں اور آگے چل کر علاقے یا صوبے کی وہ پہلی زبان مانی گئی تو بہت بڑا سہارا ملے گا۔ بہرحال اردو کچھ نہ کچھ پنپ رہی ہے اور امید کرنی چاہیے کہ پنپتی رہے گی۔"

(اردو تھیٹر۔ کل اور آج۔ مرتبین مخمور سعیدی، انیس اعظمی، اردو اکادمی، دہلی 1995، ص 104)

جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اداکاری کا شوق انھیں ممبئی لے پہنچا تھا۔ وہاں انھوں نے ڈراموں میں اداکاری کے ساتھ ساتھ فلموں میں بھی کامیاب اداکاری کی۔ ضیا سرحدی کی فلم "فٹ پاتھ" میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا۔ خواجہ احمد عباس کی فلموں "راہی"، میں دیو آنند اور نلنی جیونت، "دیا جلے ساری رات" اور "آکاش" میں اداکاری کی۔ ایس کے جھا کی فلم "ناز" میں اشوک کمار کے ساتھ کام کیا۔ "بیتے دن" کے لیے نغمے اور مکالمے لکھے، شیورام بیڈیکر کی فلم "لوک مان تلک" میں جاگیردار کے ساتھ کام کیا۔ سدھیر مشرا کی فلم "یہ وہ منزل تو نہیں" میں بھی بی ایم شاہ اور منوہر سنگھ کے ساتھ اداکاری کی۔ گذشتہ سال ان کی فلم "دی رائزنگ" (1857 کے پس منظر میں) ریلیز ہوئی جس میں انھوں نے بہادر شاہ ظفر کا اور عامر خاں نے منگل پانڈے کا رول ادا کیا ہے۔ حال ہی میں ان کی نئی فلم "بلیک اینڈ وائٹ" ریلیز ہوئی ہے۔ فرقہ پرستی کے خلاف بنی اس فلم میں انھوں نے شاعر کا کامیاب رول ادا کیا ہے۔ زیر تکمیل فلم "SHOE BITE" میں امیتابھ بچن کے ساتھ اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ فلموں کے علاوہ دو ٹی وی سیریلوں پروڈیوسر سدھانشو مشرا کے "کب تک پکاروں" اور جوہی کے "منزلیں" میں بھی کام کیا ہے۔ اردو ہندی فلموں کے ساتھ ساتھ آٹھ انگریزی فلموں میں بھی ایکٹنگ کی ہے، جو حسب ذیل ہیں:

1. Gandhi (Eng-Hindi), 2. Mount.batten (Eng-Hindi), 3. Jim Corbett (Eng. Hindi), 4. Staying on (English), 5. Mid night ember (English), 6. The Burring Season (Eng-Hindi), 7. Beserk (English), 8. Hathi (Eng-Hindi)

مندرجہ بالا آٹھ انگریزی فلموں میں سے پانچ ہندی میں بھی بنائی گئی ہیں اور انھوں نے ان ہندی فلموں میں بھی کام کیا ہے۔

آپ کو اگست 1996 میں بھارت بھون کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ انھوں

نے بھارت بھون کی سرگرمیوں میں تیزی لانے اور عملہ کو فعال بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جس نے بالآخر دھرنے اور ہڑتال کی صورت اختیار کرلی۔ عملہ کے اس غیر منصفانہ اور جارحانہ طرزعمل کے خلاف انھوں نے اپریل 1997 کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

اگرچہ حبیب تنویر کا بھوپال سے تعلق "نصف صدی کا قصہ" ہے جو آمدورفت تک محدود تھا۔ بھارت بھون سے مستعفی ہونے کے بعد بھوپال کو انھوں نے اپنا وطن ثانی بنالیا ہے۔

ڈرامے کی دنیا میں ان کے مقام و مرتبے کا اندازہ بین الاقوامی اشاعتی ادارے ROTO VISION BRGHTON LONDON کی شائع کردہ کتاب DIRECTING FOR THE STEGE کے مطالعے سے کیا جاسکتا ہے جو ساری دنیا کے چنیدہ ڈرامے ڈائریکٹرس پر مشتمل ہے۔ اس کی ایڈیٹر POLLY IRVIN کی نگہ انتخاب عالمی سطح پر صرف بارہ ڈراما ڈائریکٹرس پر ٹھہری ہے۔ اس انتخاب میں ایشیا سے صرف حبیب تنویر شامل ہیں۔

حبیب تنویر کی تھیٹریکل لائف کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا دور 1945-54 تک قیام ممبئی ہے، جسے ابتدائی جدوجہد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، دوسرا دور 1954-1996 تک قیام دہلی کا زمانہ جس میں انھوں نے ڈرامے کی شاہراہ پر یکے بعد دیگرے سنگہائے میل قائم کیے اور بلندیوں کو چھوا، تیسرا دور 1996 سے بھوپال میں قیام ہے۔

عہد حاضر میں ہندوستان کے شاید ہی کسی فنکار کی اپنے ملک اور مغربی ممالک میں اتنی قدر افزائی ہوئی ہو جتنی کہ حبیب تنویر کی! صوبائی سطح سے لے کر قومی سطح تک کے اعزازات، پدم بھوشن، راجیہ سبھا کی رکنیت، ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں، متعدد یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر، فیلوشپس اور گذشتہ سال کے "لیجنڈ آف انڈیا ایوارڈ" (Legend of India Award) کے علاوہ 21 نومبر 2004 میں شریمنت شنکر دیویہ سکار (آسام) سے سرفراز حبیب ماشاءاللہ 82 سال پورے کررہے ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں جبکہ بقول رشید احمد صدیقی "توبہ استغفار کرتے ہیں یا پھر عقد ثانی" موصوف صلہ و ستائش سے بیگانہ اپنے کام میں اسی جوش وولولہ سے معروف رہتے ہیں جو عالم جوانی میں ہوتا ہے۔

سادگی و شائستگی کا نمونہ، طبعاً منکسرالمزاج، ملاقات میں کمان کی طرح خمیدہ، لیکن اپنے موقف میں تیر کی طرح تنے رہتے ہیں۔ فرد ہو یا حکومت ان کے موقف میں نرمی یا لچک پیدا نہیں کرسکی۔ ان کے کام میں رخنہ اندازی کی جائے یا مراعات واپس لے لی جائیں، لیکن انھیں اپنے مقصد سے کوئی منحرف نہیں کرسکتا۔ گذشتہ دنوں ہندوستان کے مختلف شہروں میں اسٹیج کیا گیا ڈراما "پونگا پنڈت" پر تازہ ترین اس کی تابندہ مثال ہے۔

□□□

پتہ:
Haneefa Manzil,
74 Ashok Colony,
Noor Mahal Road, Bhopal 462001

منتخب التواریخ (جلد اول، دوم، سوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے "اکبرنامہ" کے ساتھ ساتھ ملا عبدالقادر کی "منتخب التواریخ" (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند وناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو "اکبرنامہ" سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

کاشف غزالی

چائے صنعت میں روزگار

چائے صنعت میں کاشتکاری، پروسیسنگ، فروخت، برانڈنگ، مارکیٹنگ اور تحقیق جیسے کام ہوتے ہیں۔ کاشت کاری یعنی پلانٹیشن میں چائے کے پودوں کو لگانے کے لیے مناسب مٹی تیار کرنا، کھاد دینا، موسم اور حالات کے مطابق کاشتکاری کے لیے صحیح چائے کی قسم کا انتخاب کرنا اور چائے کی پتیوں کی دیکھ بھال، نیز ان کو صحیح وقت پر توڑنے وغیرہ جیسے کام شامل ہیں۔

پروسیسنگ میں فیکٹری میں چائے کی پتیوں کو توڑنا اور انھیں دہرا کرنے جیسے کام ہوتے ہیں۔ بعد ازاں چائے کو پیک کر کے فروخت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ چائے باغانوں سے آئے ہوئے چائے کے الگ الگ نمونوں کو کوئی ٹیسٹر چکھ کر ان کا آمیزہ تیار کرتے ہیں اور فروخت کے لیے برانڈیڈ کرتے ہیں۔ ٹی براکر مارکیٹ ٹرینڈ کے مطابق انھیں بازار میں مہیا کراتے ہیں اور پھر فائنل پروڈکٹ کو مارکیٹنگ ماہرین فروخت کرتے ہیں۔

تعلیمی اہلیت اور تنخواہ: عام تعلیمی بیک گراؤنڈ کا شخص بھی چائے صنعت میں قسمت آزما سکتا ہے۔ آج کل کئی ادارے چائے مینجمنٹ کے میدان میں تربیت دے رہے ہیں۔ اس میں داخلہ کے لیے کم سے کم میٹرک یا انٹرمیڈیٹ پاس ہونا ضروری ہے۔ ایگری کلچر سائنس میں ڈگری اور باٹنی، فوڈ سائنس، ہارٹیکلچر کے متعلقہ مضامین میں بی ایس سی کرنے کے بعد ملازمت کرنے کے لیے ضروری اسکل حاصل کی جاسکتی ہے۔ بزنس مینجمنٹ یا مارکیٹ میں مہارت رکھنے والے افراد بھی چائے صنعت میں مارکیٹنگ ملازمت کر سکتے ہیں۔ زیر تربیت افراد کو شروعات میں 5 ہزار اور سینئر پروفیشنل کو 25 ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ ماہر افراد 40 ہزار سے 50 ہزار روپے یا اس سے بھی زیادہ تنخواہ پاسکتے ہیں۔

ذاتی خصوصیات: اس میدان میں کیریئر بنانے کے لیے آؤٹ ڈور لائف میں دلچسپی بہت ضروری ہے۔ جسمانی طور پر فٹ، حالات کے مطابق ڈھل جانے کی طاقت اور خود اعتمادی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پلانٹیشن / فیکٹری منیجر کے طور پر کام کرنے کے لیے قائدانہ صلاحیت اور مزدوروں کے ساتھ بہتر اخلاق کا جذبہ بھی ہونا چاہیے۔ چائے صنعت میں کام کرنے والے شخص کو ٹی مارکیٹ کی جانکاری ہونے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے حالات کے تئیں بیدار رہنے اور صحیح وقت پر صحیح فیصلہ لینا بھی ضروری ہے۔ چائے کی کاشتکاری کے لیے مناسب مٹی اور جغرافیائی حالات کا علم بھی ضروری ہے۔ ٹی ٹیسٹر کو ذائقے کی صحیح پہچان بھی ہونا چاہیے۔ اسے منھ کا قدرتی ذائقہ بنائے رکھنے کے لیے سگریٹ نوشی، شراب نوشی اور مسالے دار کھانوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ چائے بروکر میں ڈسپلن کے ساتھ ساتھ چائے پیدا کرنے والوں اور خریداروں کے لیے اچھی رپورٹ تیار کرنے کی خاصیت بھی ہونی چاہیے۔

کیریئر متبادل: چونکہ ہندوستان دنیا میں سب سے زیادہ چائے پیدا کرنے اور فروخت کرنے والا ملک ہے، اس لیے اس میدان میں بھی کیریئر کے وسیع امکانات ہیں۔ چائے بنانے والی ذاتی کمپنیوں میں ملازمت کے ساتھ ساتھ پہاڑی علاقوں میں چائے کی کاشتکاری کا کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے۔ چائے کمپنیوں یا باغان، ٹی بروکنگ ہاؤس، ٹی ایسوسی ایشنس اور ٹی بورڈ آف انڈیا میں نوجوانوں کے لیے اچھی ملازمت کے مواقع موجود ہیں۔ چائے مینجمنٹ کے میدان میں کئی قسم کے کام ہوتے ہیں اور میدان عمل کے مطابق ہی الگ الگ عہدوں پر تقرریاں کی جاتی ہیں۔

ٹی ٹیسٹر: یہ بڑی مہارت والا کام ہے۔ ٹی ٹیسٹرس چائے کے مختلف ذائقوں یا فلیور کو پہچاننے کا کام کرتے ہیں اور ان کی خاصیت کے حساب سے ان کی مختلف برانڈ کی فہرست بناتے ہیں۔ زیادہ تر کمپنیاں ٹی ٹیسٹرس کو خاصیت برقرار رکھنے اور الگ الگ قسم کا آمیزہ تیار کرنے کے لیے ملازمت پر رکھتی ہیں، اس لیے ان کے اندر چائے کی تمام قسموں کے ذائقے اور خوشبو پہچاننے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ انھیں اپنے کھان پان پر بھی کافی توجہ دینی ہوتی ہے، کیونکہ ایسا نہ کرنے سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑ سکتا ہے۔ چائے کی زیادہ مانگ والے وقت میں انھیں ضرورت سے زیادہ چائے پینی پڑ سکتی ہے۔

ان افراد کو چائے پیدا کرنے والی کمپنی کے علاوہ بروکر اور بڑے خریدار بھی ملازمت پر رکھتے ہیں۔ مینوفیکچرنگ کمپنیوں میں ٹیسٹر چائے پیدا کرنے کے دوران چائے کی پتیوں کی ساخت اور رنگ دیکھ کر یہ پتہ لگاتے ہیں کہ کہیں کوئی خامی تو نہیں ہے۔ اگر ان کے سوکھنے یا سڑنے کا خوف ہوتا ہے تو وہ اسے واپس فیکٹری بھیج دیتے ہیں۔ یہ باغانوں کے ساتھ درآمد اور برآمد پر بھی نظر رکھتے ہیں اور محققین کو ذائقہ، قیمت اور صحیح وقت کی بھی صلاح دیتے رہتے ہیں، جب کہ بروکر آفس میں یہ زیادہ تر صلاح دینے کا کام کرتے ہیں اور مینوفیکچرر کو مارکیٹنگ ٹرینڈ کے بارے میں بتاتے ہیں۔ خریداروں کے یہاں یہ ذائقہ اور

خاصیت متعین کرتے ہیں۔

پلانٹیشن /فیکٹری منیجر: چائے باغانوں کی دیکھ بھال انھیں منیجروں کے ذریعے کی جاتی ہیں اور چائے باغانوں کی ساخت کے مطابق ہی ان کی مدد کے لیے جونیئر اسسٹنٹ اور اسسٹنٹ منیجر رکھے جاتے ہیں۔ ان کا میدان عمل کافی لمبا چوڑا ہوتا ہے اور پلانٹیشن کے تمام کام انھی کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ پودے لگانے سے لے کر چائے کی پتیوں کو وزنا، ان کی پروسیسنگ، پیکنگ اور چائے کو فروخت کے مقام تک پہنچانے کا کام بھی انھی کے ذمے ہوتا ہے۔ اس عہدے پر تقرری کے لیے تجربہ ہی سب سے زیادہ معنی رکھتا ہے اور یہاں تک پہنچنے میں 12 سے 15 سال تک کا وقت لگ جاتا ہے۔ اس ضمن میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پلانٹیشن مینجمنٹ، بنگلور کے ذریعے ایک تربیتی کورس کرایا جارہا ہے۔

تحقیق: تحقیق چائے صنعت کا ایک اہم حصہ ہے اور زیادہ تر تحقیق کے کام باٹنسٹ، بایوٹیکنالوجسٹ اور دیگر سائنس دانوں کے ذریعے کیے جاتے ہیں۔ یہ زیادہ پیداوار دینے والی چائے کی قسمیں اور چائے کے امراض کو حل کرنے کے ساتھ یہ یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چائے کے آمیزہ میں قدرتی عناصر نہ کھونے پائیں۔ انھیں پیشہ سے متعلق جانکاری ٹی ٹیسٹرس سے ملتی ہے۔ تحقیقی اداروں کے علاوہ چائے باغانوں کے مالکوں کے یہاں ان کے لیے ملازمت کے بہتر مواقع ہیں۔ ٹی پی ریسرچ ایسوسی ایشن، جورہٹ، آسام تحقیقی کام کرانے والا ایک مقبول ادارہ ہے۔

ٹی بروکرس: یہ چائے پیدا کرنے والوں اور خریداروں کے درمیان پل کا کام کرتے ہیں۔ انھیں مارکیٹ ٹرینڈ کے ساتھ چائے کی بین الاقوامی قیمتوں سے ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ رہنا چاہیے۔ ایک کامیاب بروکر کے لیے چائے صنعت کے تجربہ کے علاوہ چائے کا ذائقہ پہچاننے کی بھی خاصیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ فروخت کے مقام پر ٹی بروکر کے ذریعے چائے کے سیمپل کی فہرست بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی خاصیت بھی پرکھی جاتی ہے۔

صلاح کار: ٹی بورڈ آف انڈیا اور مختلف چائے تنظیموں کے ذریعے صلاح کاروں کی تقرری کی جاتی ہے۔ تجربہ کار افراد چائے کی کاشتکاری کرنے والے صلاح کار کے طور پر بھی اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔ یہ کاشتکاری کے لیے چائے کی قسمیں، نئی درائٹی اور ان کے ذرائع بتاتے اور مخالف حالات میں پریشانیوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔

تربیتی ادارے:

- ڈپارٹمنٹ آف ٹی ہسبنڈری اینڈ ٹیکنالوجی، آسام ایگریکلچر یونیورسٹی، جورہٹ، آسام
- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پلانٹیشن مینجمنٹ، گیان بھارتی کیمپس، مالا تھلی، بنگلور
- دپرس انسٹی ٹیوٹ آف پروفیشنل اسٹڈیز، 28/23، گریا ہاٹ روڈ، کولکاتا
- این آئی ٹی ایم، دارجلنگ ٹی ریسرچ اینڈ مینجمنٹ ایسوسی ایشن، قدم تلا، دارجلنگ، مغربی بنگال
- آسام دارجلنگ ٹی ریسرچ سینٹر، کرسیانگ، دارجلنگ، مغربی بنگال
- ٹی ٹیسٹرس اکیڈمی، کلکور، نیل گرتج، کیرل
- بڑلا انسٹی ٹیوٹ آف فیوچرسٹک اسٹڈیز، پارک سرکس، کولکاتا

پتہ:

□□□

1071, Sui Walan,
Chitli Qabar, Jama Masjid,
Delhi - 110006

"کلیات سعادت حسن منٹو" — جلد اول

مرتب: شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمایے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کلیات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ "کلیات سعادت حسن منٹو" کی اس پہلی جلد میں "آتش پارے"، "منٹو کے افسانے" اور "دھواں" کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات — 565، قیمت — 285 روپے

غضنفر اقبال

پروفیسر صادق سے گفتگو

پروفیسر صادق، نظم، افسانہ، ڈراما اور مصوری کے اہم دستخط ہیں۔ ان کا اصل نام سید صادق علی ہے۔ ان کا جنم 10 اپریل 1943 کو اجین (مدھیہ پردیش) میں ہوا۔ پروفیسر صادق کی اردو اور ہندی میں ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ دہلی یونیورسٹی میں لکچرر، ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو رہ چکے ہیں۔

ہندی ساہتیہ میں بھی پروفیسر صادق کا نام اور کام عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے دوردرشن کے لیے ٹیلی اور دستاویزی فلموں کی اسکرپٹ لکھی اور کئی جرائد اور کتابوں کے سرورق بھی آپ کی مصوری کا نمونہ ہیں۔ پروفیسر صادق سے ہم نے ایک ملاقات نثری نظم کے حوالے سے کی تھی۔ اس گفتگو کے چند اقتباسات قارئین کی نذر ہیں۔ (غ الف)

- صادق صاحب، اپنی پیدائش اور رجائے پیدائش کے بارے میں کچھ بتایئے؟
- میری ولادت 1943 میں اجین میں ہوئی جو وسط ہند کا ایک قدیم شہر ہے اور مذہب و ادب اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کسی زمانے میں راجہ وکرمادتیہ کی حکمرانی تھی۔ سنسکرت کے مشہور زمانہ شاعر کالی داس اور بھرتری ہری کا تعلق بھی اسی شہر سے رہا ہے۔ میری پیدائش کے وقت شہر اجین سابق ریاست گوالیار کا ایک حصہ تھا جس پر مشہور مراٹھا سندھیا حکومت کرتے تھے۔
- آپ کے بارے میں کئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا اورنگ آباد دکن سے تعلق ہے بلکہ کئی جگہ تو یہ بات چھپی بھی ہے۔ حال ہی میں پونہ سے شائع ہونے والی ایک کتاب میں تو آپ کے نام کے ساتھ باقاعدہ اورنگ آبادی لکھا گیا ہے۔
- دراصل اورنگ آباد دکن سے میرا گہرا تعلق رہا ہے۔ اپنی نوجوانی کا زمانہ میں نے وہیں گزارا ہے۔ ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی. بھی وہیں سے کیا ہے۔ ان دنوں مختلف رسائل میں میری جو تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں ان کے ساتھ اورنگ آباد کا پتہ چھپا کرتا تھا، ممکن ہے اس وجہ سے کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہو لیکن جہاں کہیں بھی میرے سوانحی کوائف چھپے ہیں وہاں جائے پیدائش اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے ضمن میں اجین ہی لکھا گیا ہے۔ بی.اے. تک میری تعلیم بھی وہیں وکرم یونیورسٹی میں ہوئی ہے۔ میرے قریبی عزیز اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ بچپن کے بہت سے دوست بھی۔ اجین سے اب بھی میرا گہرا رشتہ ہے بلکہ اٹوٹ رشتہ ہے۔
- آپ کو شعرگوئی کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ کیا آپ کے خاندان میں کوئی شاعر و ادیب تھا جس سے تحریک پا کر آپ نے لکھنا شروع کیا؟
- جی ہاں! میرے بڑے بھائی سید محمود ذکی شاعری کرتے تھے۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق انھی کی وجہ سے ہوا۔ وہ صحافی بھی تھے۔ گھر میں اردو کے کئی اخبار و رسائل آیا کرتے تھے۔ گاہے گاہے کتابیں بھی۔ علاوہ ازیں شہر میں آنے والے اکثر شاعر و ادیب بھائی جان کی وجہ سے ہمارے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ ادبی نشستیں بھی منعقد ہوتی رہتی تھیں۔
- صادق صاحب یہ بتایئے کہ آپ نے پہلے کیا شروع کیا۔ شعرگوئی یا نثر نگاری؟
- اتفاقاً دونوں چیزیں ساتھ ساتھ شروع کیں۔ میری پہلی تخلیق ایک مزاحیہ ڈراما تھا جس میں اپنے دور کے مروجہ شاعروں کا خاکہ اڑایا گیا تھا۔ فرحت اللہ بیگ نے جو دلّی کا ایک یادگار مشاعرہ لکھا ہے اس کی پیروڈی سمجھیے۔ ڈراما نثر میں تھا لیکن اس میں جابجا اشعار بھی تھے جن میں سے بیشتر اشعار خود میرے لکھے ہوئے تھے۔
- کیا وہ ڈراما کہیں شائع بھی ہوا؟
- شائع تو نہیں ہوا۔ دراصل اسے چھپوانے کا مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا کیوں کہ وہ ڈراما میں نے اپنے اسکول کے سالانہ پروگرام میں پیش کرنے کے لیے لکھا تھا۔
- تو کیا وہ اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا؟
- جی ہاں۔ وہ ڈراما ہمارے اردو مڈل اسکول کے سالانہ پروگرام میں پیش کیا گیا۔ ہدایت کاری کے فرائض اسی اسکول کے ایک استاد کلیم صاحب نے انجام دیے تھے۔ وہ بہت لائق اور ہر دل عزیز استاد تھے۔ کلیم صاحب برسوں پہلے اسکول کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں مگر اب بھی درس و تدریس کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔
- وہ ڈراما کتنے ایکٹ کا تھا؟ کیا آپ نے بھی اس میں کوئی رول ادا کیا

تھا؟ اس موقعے کی کچھ باتیں یاد ہوں تو؟

● جی ہاں خود میں نے بھی اس ڈرامے میں رول کیا تھا، مجھے یاد ہے جب اسٹیج پر کھڑا ہوا تھا تو میری داہنی ٹانگ میں زوروں سے تھرتھراہٹ پیدا ہورہی تھی جس کی وجہ سے میں بُری طرح بوکھلا سا گیا تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ میری اس بوکھلاہٹ کو بھی ناظرین ایکٹنگ سمجھ رہے تھے۔ ویسے اس ڈرامے میں بہترین ایکٹنگ کرنے پر احمد کمال پروازی کو انعام ملا تھا۔

● احمد کمال پروازی وہی تو نہیں جو شاعری بھی کرتے تھے۔

● جی ہاں، وہ میرا ہم جماعت تھا۔ نام تو اس کا کمال احمد تھا لیکن بعد میں ابن صفی کے ناولوں کے ہیرو احمد کمال فریدی کے نام سے متاثر ہو کر اس نے اپنا نام احمد کمال پروازی لکھنا شروع کر دیا تھا۔

● صادق صاحب، کیا زمانۂ طالب علمی میں آپ کو بھی جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق رہا ہے؟

● جی ہاں، جاسوسی ناولوں کا شوق اسی زمانے میں شروع ہوا تھا اور ابن صفی کے ناولوں کے ذریعے۔ اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح میں بھی ابن صفی کا گرویدہ تھا۔ اس کے بہت سے ناول میرے پاس موجود تھے اور ہر ماہ نئے آنے والے ناول کا بے چینی سے انتظار کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ابن صفی کے تقریباً سبھی ناول میں نے پڑھ لیے تھے، کچھ تو ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھے تھے۔

● ان ناولوں کے بارے میں اب آپ کی کیا رائے ہے؟

● وہی، جو پہلے تھی۔ یعنی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔ بھئی ابن صفی کے ناولوں کا اردو کی ایک نسل کی تربیت میں بڑا حصہ رہا ہے۔ میں جناب فاروقی کی ناراضی کا خیال کیے بغیر "شب خون مرحوم" کے کم سے کم دو درجن جدید افسانہ نگار ابن صفی پر قربان کر سکتا ہوں۔

● "شب خون" کے جدید افسانہ نگاروں میں کسی زمانے میں آپ بھی تو شامل تھے۔

● بے شک میں بھی تھا اور آپ کے والد محترم حمید سہروردی بھی۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے، آپ قربانی کے دو درجن افسانہ نگاروں میں ہمارے نام بھی شامل کر سکتے ہیں۔

● بات کا موضوع بدل گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے ایک دوسرا سرا ہاتھ آ گیا ہے۔ آپ افسانے بھی تو لکھتے رہے ہیں۔ یہ بتائیے کہ اس ڈرامے کے بعد آپ کی تخلیقی سرگرمیاں کیا رہیں؟ کیا آپ نے اس ڈرامے کے بعد اور ڈرامے بھی لکھے۔

● اس کے بعد ڈرامے تو نہیں لکھے لیکن ڈرامے کا شوق برابر پروان چڑھتا رہا۔ ہائی اسکول میں میں نے کئی ڈراموں میں حصہ لیا۔ کالج پہنچنے کے بعد ایکٹنگ کا شوق تو جاتا رہا لیکن ڈرامے دیکھنے، پڑھنے اور اسٹیج پر پیش کیے جانے والے ڈراموں پر تبصرے کا شوق ہوگیا جو آج تک جاری ہے۔ ہندی ہفت روزہ "دن مان" کے کالموں میں نیشنل اسکول آف ڈراما وغیرہ کی سرگرمیوں کی رپورٹیں چھپا کرتی تھیں۔ ابراہیم القاضی کا مداح میں اسی زمانے سے رہا ہوں۔ میرے اس شوق کو ڈاکٹر پربھات بھٹاچاریہ نے مہمیز کیا جو میرے استاد تھے اور تجرباتی ڈرامے لکھتے تھے۔ ان کا ڈراما "روشنی کی چار دیواری" اسی زمانے کی یادگار ہے جس کی پیش کش میں روشنیوں کے ذریعے تاثرات پیدا کرنے کے سلسلے میں عمیق حنفی کے مشورے بھی شامل رہے ہیں۔ میں نے اس ڈرامے کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اسی زمانے سے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھتا رہا ہوں۔ افسانے میں نے بہت بعد میں لکھنا شروع کیے، اس سے پہلے شاعری شروع کر چکا تھا۔

● آزاد شاعری؟

● نہیں عزیزم۔ ایک دم آزاد شاعری کیسے کر سکتا تھا۔ میں پہلے تو غزلیں اور پابند نظمیں لکھتا رہا۔ پھر چند برس پیروڈیاں لکھا کیا، تب کہیں جا کر آزاد نظم اور پھر نثری نظمیں لکھنے کی طرف مائل ہوا۔

● یعنی آپ روایتی شاعری کی ڈگر سے جدید شاعری کی راہ پر آئے؟

● بالکل نہیں۔ روایتی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد خود میں نے کبھی اس قسم کی شاعری نہیں کی۔ روایتی شاعری کی ڈگر پر میں کبھی نہیں چلا۔ شاید چل بھی نہیں سکتا تھا۔ میری پہلی غزل جب دہلی کے ہفت روزہ "آئینہ" میں شائع ہوئی تھی تو ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب (مدیر) نے ایڈیٹوریل میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اب کی بار دو غزلیں اس طرز کی دی جا رہی ہیں جنھیں دیکھ کر پرانی غزل کا عبرت ناک انجام آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور یہ بھی کہ یہ ادب کی کوئی نئی راہ ہے یا بے راہ روی اس مسئلے کو ہم چوراہے پر لا کر شاعر اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان چھوڑتے ہیں۔ میری غزل کے ساتھ ہی عادل منصوری کی بھی ایک غزل چھپی تھی۔

● اپنی اس غزل کا کوئی شعر یاد ہے آپ کو؟

● پوری غزل یاد تھی، اب نہیں رہی لیکن ایک شعر سنیے:

روز ازل سے دونوں ہاتھ لکیروں سے خالی ہیں
میرے ہاتھ قلم تھا کاتب قسمت کیسے لکھتا؟

یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں ان دنوں اپنے چند دوستوں کے زیراثر پامسٹری سیکھنے میں گہری دل چسپی رکھتا تھا اور اسی شوق کا اثر اس شعر میں در آیا تھا۔

- چلیے مان لیا کہ آپ روایتی شاعری کی ڈگر سے جدیدیت کی راہ پر نہیں آئے لیکن اس کے کچھ تو محرکات رہے ہوں گے۔ کہیں یہ فاروقی صاحب کی شب خونی جدیدیت کے اثرات تو نہیں تھے؟
- ہرگز نہیں۔ جب فاروقی صاحب 'مرضیات جنسی کی نفسیات' نام کی کسی کتاب کے مترجم کی حیثیت سے ''شب خون'' کے قارئین کو چونکانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کے بطن میں خوابیدہ نقاد ابھی بیدار نہیں ہوا تھا، تب تک میں جدید نظمیں اور نثری نظمیں لکھنے لگا تھا۔ ن۔م۔ راشد، میراجی، عبدالمجید بھٹی، قیوم نظر، یوسف ظفر، تصدق حسین خالد وغیرہ کے علاوہ ہندی کے چند جدید شاعروں سے متاثر تھا۔
- نثری نظم کے 1960 سے 1970 کے درمیان اولین لکھنے والوں میں آپ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے؟
- دیکھیے جب اردو میں نثری نظموں کی اشاعت کی شروعات ہوئی اس زمانے میں بیشتر اردو رسائل نثری نظمیں شائع کرنے سے گریز کرتے تھے۔ پھر بھی اس دہے میں جن شاعروں کی نثری نظمیں منظرعام پر آئیں وہ سید سجاد ظہیر، حسن شہیر، احمد ہمیش اور صادق تھے۔ اولذکر دونوں کی نثری نظمیں ان کے مجموعوں میں شائع ہوئیں، احمد ہمیش کی اور میری نظمیں ''شب خون'' (الہ آباد) ''شعروحکمت'' (حیدرآباد) اور ''انتخاب'' (گلبرگہ) وغیرہ جیسے رسالوں میں گاہے بہ گاہے شائع ہوتی رہیں۔ ان تمام رسالوں کے فائل دستیاب ہیں۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں نثری نظم کے میدان میں احمد ہمیش اپنی صلاحیتوں کے خوب جوہر دکھا رہا تھا۔ میری طرح وہ بھی اس معاملے میں ہندی شاعروں سے متاثر تھا۔ میرے ساتھ یہ تھا کہ ہندی کا ایک بڑا شاعر گجانن مادھوکتی بودھ میرے ہی شہر سے تعلق رکھتا تھا۔ جگدیش چترویدی کا بھی اجین سے تعلق تھا۔ چندرکانت دیوتالے ان دنوں ہمارے کالج کے شعبۂ ہندی میں نئے نئے آئے تھے۔ کوشل مشر، وشد ہپ بنرجی اور ہریش پاٹھک وغیرہ میرے کالج کے ساتھیوں میں سے تھے اور سبھی نثری نظمیں لکھا کرتے تھے۔ میں ہندی کے ادبی رسالے بھی پڑھا کرتا تھا جن میں نثری نظمیں خوب چھپتی تھیں۔

- نثری نظم سے اتنا گہرا تعلق ہونے کے باوجود آپ نے اپنے اولین شعری مجموعوں میں نثری نظموں کو شامل نہیں کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟
- میرے صرف پہلے شعری مجموعے ''دستخط'' میں جو 1973 میں شائع ہوا تھا'' نثری نظمیں نہیں تھیں۔ اس کے بعد 1976 میں جب میرا دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا تو اس میں نثری نظمیں شامل تھیں، بلکہ اس میں تو میری طویل نثری نظم ''گزرتے ہوئے'' بھی شامل ہے جو اس وقت تک لکھی گئی پہلی طویل نثری نظم تھی۔ یہ نظم سہ ماہی ''غبار خاطر'' میں بھی شائع ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں اسی دہائی میں جب فضل تابش نے مدھیہ پردیش کے شعروادب کا ایک ضخیم انتخاب شائع کیا تو انھوں نے اس نظم کو ایک بار پھر شائع کیا۔ اس طرح یہ نظم اردو میں تین بار شائع ہو چکی ہے۔
- گویا آپ کی اس طویل نثری نظم کی خوب پذیرائی ہوئی؟
- میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں اردو میں یہ نظم تین تین بار شائع ہونے کے باوجود فلاپ گئی۔ عتیق اللہ نے ضرور اس پر اظہار خیال کیا لیکن انھوں نے حق دوستی ادا کیا ایسا سمجھا گیا ہوگا۔ کیوں کہ کسی اور نقاد نے اس پر نہ تو کچھ لکھا اور نہ ہی کہیں ذکر کیا جب کہ میرے نزدیک یہ ایک بے حد اہم اور منفرد تجرباتی نظم ہے۔ نو دس سال بعد یہ نظم دہلی کے ایک ہندی رسالے ''ورگھا'' میں شائع ہوئی بعد میں ڈاکٹر نریندر موہن نے اسے صدی کی بہترین لمبی کویتائیں کے نام سے شائع ہونے والے انتخاب میں شامل کرلیا۔ ہندی کے کئی نقادوں نے اس کا ذکر بھی کیا اور اس پر لکھا بھی ہے۔
- آپ کے نزدیک اس کی کیا وجہ ہے کہ اردو میں اسے نظرانداز کر دیا گیا اور ہندی میں اس کی پذیرائی ہوئی؟
- میرے نزدیک اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اردو میں اس وقت تک نثری نظم کو قبول نہیں کیا گیا تھا۔ ویسے اب بھی صورتحال کچھ زیادہ امیدافزا نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ میرا ڈکشن ہندی آمیز ہے جو غزلوں اور آزاد نظموں میں تو اردو قارئین کسی حد تک گوارا کرتے رہے لیکن نثری نظم میں نہیں کر سکتے، تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ نظم مخصوص مزاج، مذہبی فکر، رسم و رواج اور حوالوں کے علاوہ وسط ہند کے مخصوص خطے کا جغرافیائی ماحول اور پس منظر لیے ہوئے تھی جو اردو کی شاعری کے ماحول سے یکسر مختلف اور اردو قارئین کے لیے تحیر آمیز ہونے کے باوجود بالکل نامانوس تھا۔ میں نے اس کی تخلیق میں فن مصوری اور موی فوٹوگرافی کی تکنیک سے بھی کام لیا تھا اور ورل ہسٹری سے بھی استفادہ

کیا تھا جس کے نتیجے میں میرے نزدیک وہ نظم ایک بے حد منفرد اور کامیاب تجرباتی نظم بن گئی تھی لیکن ہوا یوں کہ وہ قارئین کو متوجہ نہ کر سکی۔

- گویا اردو کے نقادوں نے آپ کو مایوس کیا اور اتنی اچھی نظم کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے اسے نظر انداز کر دینے میں ہی بہتری سمجھی؟
- اب آپ کچھ بھی سمجھ لیجیے، کچھ بھی کہہ لیجیے لیکن میں تو کہوں گا کہ شاید نقادوں کو میں نے مایوس کیا ہوگا۔ کیوں کہ میں نقادوں کو ذہن میں رکھ کر تو لکھتا نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں دوسری طویل نثری نظم ''مجذوب'' نہ لکھ پاتا جسے میں اپنی دوسری بہترین نثری نظم تصور کرتا ہوں۔
- یہ نظم شاید آپ کے تیسرے شعری مجموعے میں شامل ہے۔
- جی ہاں ''کشاد'' میں شامل ہے اور میرے چوتھے مجموعہ نظم ''خواب کے جلنے کا منظر'' میں اپنی توسیعی اور مکمل شکل میں شامل ہے۔
- میں سمجھا نہیں۔ توسیعی اور مکمل شکل سے آپ کی کیا مراد ہے؟
- دراصل ہوا یوں تھا کہ اپنے قیام اورنگ آباد کے دوران میں وہاں اکثر ایک مجذوب کو دیکھا کرتا تھا جو میرے گھر کے راستے میں مسجد کے پاس نیم برہنہ حالت میں پڑا رہتا تھا۔ جوگندر پال بھی اس زمانے میں اورنگ آباد میں ہی رہا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی اس مجذوب کو دیکھا تھا اور اس پر ایک کہانی لکھی تھی۔ کچھ عرصے بعد اسی پر پھر ایک کہانی لکھی اور اس طرح وہ مجذوب ان کی کئی کہانیوں میں جلوہ گر ہوا۔ میں جب تک اورنگ آباد میں رہا میں نے اس پر کچھ نہیں لکھا۔ لکھنا ضروری بھی نہیں تھا۔ میرے دہلی آجانے کے کئی سال بعد ایک دن وہ مجذوب یکا یک میرے ذہن کے کسی گوشے سے نمودار ہوا اور میرے تخلیقی اظہار کا حصہ بن گیا۔ یہ 1992 کی بات ہے۔ انھی دنوں جب میں نے ''کشاد'' نام سے اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا تو اس میں نظم ''مجذوب'' بھی شامل کر لی، چھپ گئی۔ کئی برس گزر گئے ایک مرتبہ تخلیقی ترنگ میں جب نظم لکھنے بیٹھا تو پھر وہی مجذوب ذہن میں آ گیا۔ چند سطریں لکھنے کے بعد میں نے اپنی وہ مطبوعہ نظم نکال کر پڑھی۔ خیال آیا کہ کردار اور موضوع ایک ہی ہے تو کیوں نہ اسی نظم کو آگے بڑھایا جائے اس طرح پچھلی نظم کے حوالے اور تکرار سے بچا جا سکتا ہے۔ سو میں نے اپنی نظم کی توسیع کرنے کی سعی کی اور اس طور نظم ''مجذوب'' مکمل ہو گئی۔ مجذوب سے گلو خلاصی کے بعد میں نے تو چین کی سانس لی لیکن جوگندر پال صاحب کا پیچھا اس مجذوب نے اب تک نہیں چھوڑا ہے۔ ان کی ایک اور کہانی ''کھودو بابا کا مقبرہ'' میں وہ پھر آ موجود ہوا۔
- بڑی دلچسپ بات بتائی آپ نے اب یہ بتایئے کہ آپ نے اب تک کل ملا کر کتنی نثری نظمیں لکھی ہوں گی؟
- بھئی تعداد تو مجھے خود نہیں معلوم۔ کبھی گنتی کی ہوتی تو معلوم ہوتا کہ کتنی ہو گئیں۔ کئی تو اب میرے پاس ہیں بھی نہیں۔ رسالوں میں چھپ گئیں اور قصہ ختم۔
- آپ ساٹھ کی دہائی سے نثری نظمیں لکھ رہے ہیں جو گاہے بہ گاہے اردو کے ادبی رسالوں میں چھپتی رہی ہیں۔ میرا خیال ہے تب سے اب تک اتنی نثری نظمیں تو ضرور ہو گئی ہوں گی کہ آپ ان سب کو جمع کر کے اپنی نثری نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کر لیں۔
- ہاں اتنی نظمیں ہو گئی ہوں گی۔ وقت ملا تو آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔
- صادق صاحب! ایک بات اور بتایئے۔ اگر آپ کو اپنی نمائندہ نظموں کا مجموعہ مرتب کرنے کو کہا جائے تو کیا آپ اس میں نثری نظمیں بھی شامل کریں گے۔
- یقیناً کروں گا۔
- کون کون سی نظمیں؟
- ''گزرتے ہوئے'' شامل کروں گا، ''مجذوب'' کروں گا، اور بھی کئی نظمیں ہیں مثلاً ''عذابوں کا شہر''، ''ایک بار پھر''، ''پہاڑ کا سپنا''، ''کیا تم مرد نہیں؟''، ''مہاگر'' اور بھی کئی نظمیں ہیں جن کے عنوانات اس وقت یاد نہیں آ رہے ہیں۔
- آپ سے انٹرویو لینے سے پہلے میں سوچتا تھا کہ آپ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور آپ ایک ساتھ کئی میدانوں میں کام کرتے رہے ہیں، مثلاً آرٹسٹ آپ رہے ہیں، کارٹونسٹ آپ رہے ہیں، پیروڈی نگاری اور طنز و مزاح نگاری بھی کرتے رہے ہیں، افسانے لکھے ہیں، ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں، تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی کام کرتے رہے ہیں، ڈاکیومنٹری فلمیں بھی بنائی ہیں آپ نے تو میں اتنی سب چیزوں کو ایک انٹرویو میں کیسے سمیٹ پاؤں گا۔ جس کا ڈر تھا وہی بات سامنے آئی ہے۔ آج کی نشست میں آپ کے دور آغاز کی تخلیقی سرگرمیوں کے علاوہ صرف نثری نظموں پر ہی گفتگو ہو سکی ہے۔ انشاء اللہ اگلی ملاقات میں بات آگے بڑھے گی اور دور تک جائے گی۔
- (اٹھتے ہوئے) ایسے موقع پر کہا جاتا ہے ''یار زندہ صحبت باقی''

□□□

پتہ:
Saiban, Zubair Colony, Hagenga Cross,
Ring Road, Gulbarga-585104 (K.S.)

انجم مانپوری

(ہماری مطبوعات سے)

انٹرویو

انٹرویو کے قسموں میں ایک انٹرویو تو وہ ہوتا ہے جو پریس کے نمائندوں اور لیڈروں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اب اگر لیڈر، مہاتما یا مولانا قسم کا ہے تو اخباری نمائندے اس کے گھر جا جا کر انٹرویو کے لیے خوشامدیں کرتے ہیں اور لیڈران کی صبح وشام کی حاضری سے پریشان رہتا ہے اور اگر اپر گریڈ کا نہیں بلکہ لور کلاس اور پروفیشنر قسم کا لیڈر ہے تو بجائے اس کے کہ پریس کے نمائندے اس کے پاس پہنچیں یہ غریب خود ہی ان کے گھر پہنچ کر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے انٹرویو قسم کے سوال وجواب حوالہ کر کے منتیں کرتا ہے کہ:

بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے

ان دونوں قسموں کے انٹرویو کو اخباری انٹرویو کہتے ہیں۔ اس اخباری انٹرویو کے علاوہ ایک سرکاری انٹرویو ہوتا ہے جو سرکاری ملازمت کے سلسلے میں ''اپوائنٹمنٹ آفیسرس'' اور امیدواروں کے درمیان ہوتا ہے۔ ان اخباری اور سرکاری انٹرویو میں منجملہ اور بہت سی باتوں کے سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کی غرض ملک میں سیاسی بیداری پیدا کر کے جاہل اور نااہلوں کو سیاسیات سمجھنے کا اہل بنا کر انھیں ملکی کام کے لائق بنانا ہے اور دوم الذکر انٹرویو کا مقصد تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ''ڈس کوالیفائیڈ'' اور نااہل ثابت کر کے انھیں نکما، بیکار اور پست ہمت بنانا ہے۔

بعض انٹرویو زدہ کنڈیڈیٹ بے سمجھے بوجھے یہ اعتراض کر دیتے ہیں کہ امیدواروں کی درخواستوں کے ساتھ ان کی تعلیمی ڈگریاں اور دوسرے کوالیفیکیشن کی سارٹیفکٹس تو منسلک رہتی ہیں پھر کون سی ضروری اور نئی بات معلوم کرنے کے لیے خواہ مخواہ انٹرویو کی بیخ لگا دی گئی ہے۔ اب انھیں انٹرویو کی مصلحتوں کو کون سمجھائے۔ ان ناواقفوں کو یہ تو معلوم ہی نہیں کہ سرکاری ملازمتوں کی جگہیں صرف گنتی کی چند ہی ہوتی ہیں اور امیدواروں کی تعداد کی کوئی خاص حد ہی نہیں۔ اس پر سرکار کے اقبال سے سیکڑوں ان میں ایک سے ایک بڑھ کر قابل اور صاحب صلاحیت، اب ان میں سے ضرورت کے مطابق چند معہودفی الذہن مخصوص امیدواروں کو نامزد کرنے کی غرض سے ''بقیہ کوالیفائیڈ کنڈیڈیٹ'' کو ڈس کوالیفائڈ بنانے کے لیے انٹرویو سے بڑھ کر اور کون سی خوبصورت ترکیب سوچی جاسکتی ہے۔ یونیورسٹی کی ڈگری تو قرق کی نہیں جاسکتی۔ ''اعلیٰ کوالیفیکیشن'' اور علمی حیثیت کی سرٹیفکیٹ نیلام والی سرٹیفکیٹ تو ہے نہیں جو کم حیثیت قرار دے کر مسترد کر دی جائے۔ اب مخصوص امیدواروں یا دعویداروں کو ان سرکاری جگہوں پر قبضہ دلانے کے لے بقیہ درخواست دینے والوں کو کس طرح غیر مستحق ثابت کیا جائے۔ انھی دقتوں کو رفع کرنے کے لیے ایک مستقل انٹرویو کمیٹی ایجاد ہوئی، جس کے ذمّے کہنے کو تو برائے نام ''انکوائری'' ہے مگر درحقیقت سمری ٹرائل (Summary Trial) کا فل پاور (Full Power) دے کر امیدواروں کی قسمت کے ''فائنل'' فیصلہ کا بھی اختیار دیا گیا اور یہ سرسری سماعت اور اس پر فیصلہ کے لیے کسی خاص اصول یا ضابطہ کی پابندی کی ضرورت نہیں، صرف اختیار تمیزی کا ایسا بے پناہ حربہ اس کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ جس کے ضرب کی کوئی داد وفریاد نہیں۔

چونکہ از ابتدائے ڈپٹی مجسٹریٹی بعنایت ٹمپریری کلر کی بحیثیت ''کنڈیڈیٹ'' کے مجھے انٹرویو کے بیسوں مواقع ملے ہیں، اس لیے ایک سینئر کنڈیڈیٹ کی حیثیت سے اپنے انٹرویو کے دل چسپ تجربات پیش کرتا ہوں تاکہ عام دلچسپی کے علاوہ ممکن ہے کہ امیدواروں کو انٹرویو کے امتحان کے موقع پر ''کی'' (Key) کا کام دیں۔

بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد لاء کالج میں نام لکھوائے تقریباً ڈیڑھ سال ہوئے تھے کہ ڈپٹی مجسٹریٹی کی تقرری کا اعلان گزٹ میں دیکھ کر میں نے سوچا کہ بحیثیت وکیل ڈپٹیوں کو حضور ''یور اونر'' کہنے کی بجائے خود ہی ''یور اونر'' بننے کی کیوں نہ کوشش کروں۔ چنانچہ میں نے بھی ایک درخواست مع تعلیمی سرٹیفکیٹ بذریعہ بک پوسٹ روانہ کر دی۔ ایک ہفتہ کے بعد طلبی کا سمن جسے ایسے موقعوں پر انٹرویو کارڈ کہتے ہیں، کورٹ کے چپراسی کی بجائے جب ڈاکیہ نے مجھ پر تعمیل کیا تو انٹرویو میں ڈپٹی مجسٹریٹی کی صلاحیت جانچنے کے لیے جتنے سوالات کیے جاسکتے ہیں سب کے جوابات ذہن نشیں کر کے مقررہ تاریخ پر ہاف پینٹ اور ہاف شرٹ زیب تن کیے بہم ڈپٹیائی کی شان سے انٹرویو آفس کے باہر پہنچا۔ ساتویں کنڈیڈیٹ کے بعد جب میرا نمبر آیا، دل میں یہ مصرعہ

''آزادی کے بعد اردو طنزومزاح'' سے ماخوذ، مرتب: **ابوالکلام قاسمی** / صفحات 655، قیمت : -/457 روپئے

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

اب قلم تھام کے بیٹھو مری باری آئی

پڑھتا ہوا افسرانِ انٹرویو کے سامنے حاضر ہونے کے بعد جیسے ہی کرسی پر سامنے جا کر بیٹھا تھا کہ پہلا سوال مجھ سے یہ کیا گیا۔

سوال: آپ کا خاندانی پیشہ کیا ہے؟

یہ بے جوڑ سوال سن کر میں سوچنے لگا کہ آخر ڈپٹی مجسٹریٹی سے اس سوال کو لگاؤ کیا ہے، مگر ذہانت بھی عجیب خداداد چیز ہے فوراً کڑی ملانے کے لیے میں نے جواب دیا۔

جواب: جنابِ عالی! اصلی پیشہ تو ہے زمینداری مگر اس سلسلے میں مقدمہ بازی کو بھی ایک طرح سے ہم لوگوں کا سیکنڈ پیشہ سمجھ لیجیے، جس کی وجہ سے ''سول'' (Civil) اور کریمنل (Criminal) مقدمات کے اکثر دفعات سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس لیے قانون دانی گویا ہم لوگوں کی گھٹی میں ہے۔

سوال: کالج سے نکلنے کے بعد اب تک آپ کا کیا شغل رہا؟

جواب: وہی مقدمات کی پیروی، مسل کی ورق گردانی، حسبِ خواہ شہادتیں فراہم کرنا، گواہوں کو تعلیم دینا، اس کی وجہ سے مجھے ایسی مہارت پیدا ہوگئی ہے کہ ڈپٹی مجسٹریٹ ہو جانے کے بعد صرف صورت دیکھ کر پہچان لوں گا کہ کون گواہ سچا ہے اور کون جھوٹا، اس تجربہ کی بنا پر فیصلہ لکھنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوگی۔

سوال: زمینداری کی حکومت چھوڑ کر ملازمت کی اس غلامانہ زندگی کو آپ نے کیوں پسند کیا؟

جواب: جناب ڈپٹی مجسٹریٹی کی شان اور حکومت کے سامنے زمینداری کی بھی کوئی حقیقت ہے۔ بڑے بڑے زمیندار، ایک معمولی تھرڈ کلاس ڈپٹی کی بیگار میں کام کرنا اپنی عزت سمجھتے ہیں۔

سوال: (مسکرا کر) زمینداری کی بدولت کافی سرمایہ رہتے ہوئے بزنس چھوڑ کر ڈیڑھ دو سو روپئے ماہانہ کی ڈپٹی مجسٹریٹی پر کیوں جان دیتے ہیں؟

جواب: اگر آدمی ٹیکٹ فل (Tact Full) ہو تو ڈپٹیائی کی بزنس بھی کم نفع بخش نہیں۔

سوال: (اپنے ساتھیوں کو آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کے باہر مسکرا کر دیکھتے ہوئے) آب و ہوا کے اعتبار سے آپ کے خیال میں ہندوستان کا کون کون سا خطہ انسانی صحت کے لیے مفید اور کون کون مضر ہے؟

جواب: حضور! جب ڈپٹی مجسٹریٹی کرنی ہو تو آب و ہوا کے مضر یا صحت بخش ہونے کی آدمی کہاں تک پرواہ کرے۔ آپ جہاں ڈپٹی بنا کر بھیج دیجیے، اگر ذرا بھی عذر کروں تو فوراً ڈسمس کر دیجیے۔

یکے بعد دیگرے مسلسل سوالوں کے دندان شکن بلکہ جبڑا اور کلہ شکن جواب دے کر ایسا منہ بند کر دیا کہ پھر اور مزید سوالوں کی ہمت نہ پڑی۔ آخر ''اچھا آپ اب جا سکتے ہیں'' کہہ کر مجھ سے پیچھا چھڑایا۔ میں بھی خوش خوش دل میں یہ سوچتا ہوا اپنے گھر واپس آیا کہ یہ حضرت بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ کس کنڈیڈیٹ سے پالا پڑا ہے۔ لیکن چند ہی روز کے بعد میرے ان دندان شکن جوابوں کا ایسا ہمت شکن اور دل شکن نتیجہ معلوم ہوا کہ مجھ ہی جیسا تحمل مزاج آدمی تھا کہ غصے کے مارے اراکین انٹرویو کو صرف دل ہی دل میں برا بھلا کہنے پر اکتفا کیا ورنہ دوسرا کوئی اور کنڈیڈیٹ ہوتا تو خودکشی کر کے حکم دہندوں میں ان ممبروں کا نام لکھوا کر ایسا پھنسا دیتا کہ پھر انٹرویو میں لوگوں کو دق کرنا ہی بھول جاتے۔

میرے سلکٹ (Select) نہ کرنے کی وجہ جب میرے ایک ہمدرد نے ایک ممبر سے پوچھی تو ارشاد ہوا کہ صرف ''جنرل نولج'' کا اندازہ لگانے کے لیے بہت ہی غیر متعلق ادھر ادھر کے سوالات کیے گئے تھے۔ مگر ہر غیر متعلق سوال کی کڑی ہیر پھیر کو انھوں نے ڈپٹی مجسٹریٹی کے پوسٹ سے ملا دی جس کی وجہ سے ہم لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ جنرل نالج تو کیا آپ کے کنڈیڈیٹ میں ''کومن سنس'' (Common Sense) تک نہیں۔

اب آپ ہی بتلا ایماناً خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر کہیے کہ بلایا گیا تھا میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے کنڈیڈیٹ کی حیثیت سے اور پوچھا جاتا ہے صحت بخش آب و ہوا کے متعلق۔ ڈپٹی مجسٹریٹی کے امیدوار کو ہیلتھ آفیسری کا کنڈیڈیٹ سمجھنا یہ خود کہاں تک کومن سنس کے مطابق ہے۔

خیر پہلے انٹرویو کے اس تجربے نے یہ بتلا دیا کہ انٹرویو سسٹم قابلیت و اہلیت اور صلاحیت و لاحیت جانچنے کے لیے نہیں جاری کیا گیا ہے، بلکہ صرف کومن سنس اور جنرل نالج کا اندازہ لگانے کے لیے۔ لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جنرل نالج کسی خاص علم وفن کے جاننے کا تو نام نہیں بلکہ دنیا بھر کے معلومات کو جنرل نالج کہتے ہیں۔ اب آپ ڈپٹی مجسٹریٹی کنڈیڈیٹ کی حیثیت سے انٹرویو میں بلائے گئے ہیں اور پوچھا جاتا ہے آپ سے ڈاکٹری کے متعلق کہ پلیگ اور طاعون میں کیا فرق ہے۔ یا آپ منصفی کے کنڈیڈیٹ ہیں اور آپ سے دریافت کی جاتی ہیں انجینئری کی باتیں کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کس طرح سے بن سکتی ہے یا رجسٹراری کے انٹرویو میں بلائے گئے ہیں اور آپ کا امتحان لیا جاتا ہے علم نباتات کے متعلق کہ آپ گھاس کاٹ سکتے ہیں یا نہیں غرض کہ معلومات کی حیثیت سے آپ چوں چوں کا مربہ ہیں یا نہیں۔ ایسی حالت میں انسائیکلوپیڈیا حفظ کیے بغیر انٹرویو میں جانا خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی یا سر پر ہتھوڑا مارنے کے برابر ہے کہ نہیں؟

اس لیے میں نے سوچا کہ انسائیکلوپیڈیا اگر نہیں تو جنرل نالج کے لیے کم

سے کم بک آف نالج کا حافظ ہو جانا بس ضروری ہے۔

چنانچہ آئندہ سال کنڈیڈیٹ ہونے کے لیے انٹرویو کے امتحان کی تیاری کی غرض سے بک آف نالج کی اسٹڈی شروع کردی۔ اتفاق سے اس کے چھ سات ہی ماہ بعد منصفی کی تقرری کا اعلان گزٹ میں دیکھ کر میں نے سوچا کہ ڈپٹی مجسٹریٹی کی امید میں ایک سال تک اپنے ہاتھ پر ہاتھ یا کسی کے پاؤں پر پاؤں دھرے بیٹھے رہنا مناسب نہیں بلکہ دوسری سروس کے لیے بھی گھونسے لات کی شکل چھوڑ کر اور ہر طرح سے ہاتھ پاؤں مارنا چاہیے۔ اس خیال کو مدنظر رکھ کر منصفی کی درخواست بغیر اسٹامپ چسپاں کیے وکالتاً نہیں بلکہ اصالتاً داخل کردی۔ حسب دستور تاریخ مقررہ پر انٹرویو میں جو حاضر ہوا تو سوالات کی ابتدا اس طرح سے شروع ہوئی۔

سوال: آپ نے اس سے پہلے بھی کسی سروس کے لیے اپلائی (Apply) کیا تھا؟

جواب: جی ہاں ڈپٹی مجسٹریٹی کے لیے۔

سوال: آپ کو معلوم ہے آپ کا نام کیوں نہیں بھیجا گیا؟

جواب: مؤثر ذرائع نہیں رہنے کی وجہ سے۔

سوال: یہاں ذرائع کا کیا کام، صلاحیت اور قابلیت کی کمپیٹیشن میں جو کمپلٹنٹ کنڈیڈیٹ ہوتا ہے اس کا انتخاب ہوتا ہے۔ چوں کہ اس کمپیٹیشن میں آپ پورے نہیں اترے ہوں گے اس لیے آپ کا نام نہیں بھیجا گیا۔

جواب: حضور، اس کو میں بھی عرض کر رہا ہوں کہ کوالیفیکیشن میں تو خدا کے فضل سے نہیں البتہ ریکومینڈیشن کے کمپیٹیشن میں کافی نمبر نہیں لا سکا۔

سوال: ڈپٹی مجسٹریٹی اور منصفی ان دونوں سرکاری سروسوں میں آپ کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟

جواب: حضور بات یہ ہے کہ ڈپٹیوں کو صرف مار پیٹ، چوری ڈکیتی، نقب زنی، خون ریزی وغیرہ کے مقدمات کی سماعت کی وجہ سے روزانہ ڈاکوؤں، بدمعاشوں، چوروں، اٹھائی گیروں سے واسطہ رہتا ہے" اور "صحبتِ صالح ترا صالح کند" کا مقولہ غلط نہیں ہے۔ یہ جو ڈپٹیوں میں شانِ غرور، ڈینگ، ہیکڑی اور "ہم چو من دیگرے نیست" قسم والا انداز دیکھتے ہیں یہ انھی صحبتوں کا اثر ہے۔ برخلاف اس کے منصفوں کو انھیں اپنے اجلاس پر زیادہ تر بڑے بڑے دولت مندوں، سرمایہ داروں کی ڈگری دلانے کی وجہ سے متکبر مزاج مہاجنوں اور ساہوکاروں سے تعلقات رہتے ہیں اور یہ منصفوں میں جو کہ یہ مسکین قسم کی انکساری وغیرہ دیکھتے ہیں، یہ انھی ساہوکار بنیوں کی فیض صحبت کا اثر ہے۔ اس لیے فرسٹ کلاس ڈپٹی مجسٹریٹی کے عوض فرسٹ، سیکنڈ منصف کیا تھرڈ کلاس منصف ہونا میں کہیں بہتر سمجھتا ہوں۔ چنانچہ اس منصفی کے بارے میں شاعروں نے بھی کہا ہے:

منصفی ہو تو غضب نا منصفی ہو تو ستم
تمھیں منصفی سے کہہ دو تمھیں اعتبار ہوتا

سوال: آپ نے وکالت بھی پاس کی ہے یا نہیں؟ اور اگر کی ہے تو پاس کیے کتنے دن ہوئے؟

جواب: حضور، "سول" اور "کریمنل" دونوں سبجیکٹ میں پاس کیا ہے اور پاس کیے ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے۔ آپ اسی سے سمجھ لیجیے کہ ابھی ڈگری تک بھی نہیں ملی ہے، گون تک نہیں بنوایا ہے، ایک دم "تازہ فرش" وکیل ہوں۔

سوال: آپ کو معلوم ہے کہ منصفی میں اپلائی (Apply) کرنے کے لیے کم سے کم چھ ماہ کی پریکٹس لازمی ہے؟

جواب: حضور، منصفی میں تو وکالت اور قانون دانی کی چنداں ضرورت ہی نہیں۔ "شہر سکھائے کوتوالی" کی مثل کے مطابق جب ایک معمولی ڈپٹی وکیل کی بحث سنتے سنتے قانون داں ہو جاتا ہے تو بیچارے منصف ایسے بھدے دماغ کے تھوڑے ہی ہوتے ہیں کہ بحث کے وقت سمجھانے پر بھی دماغ میں نہ آئے۔ قانون پڑھنے اور دفعات سمجھانے کا پیشہ تو وکلا کا ہے۔ بیچارے حاکموں کا کام تو اجلاس پر صرف اظہار جرح لکھنا، بحث سننا اور فریقین کے وکلا میں سے جس نے زبردستی جو قانون دماغ میں ٹھونس دیا، اسی کے مطابق فیصلہ دینا۔ یہ چھ ماہ کی پریکٹس کی قید تو بلا قصور منصفوں پر ٹھوک دی گئی ہے اور اگر اس پر بھی یہ قید حضور لازمی سمجھتے ہیں تو پروبیشن (Probation) کے زمانے میں چھ ماہ کیا سال بھر تک اس کی کمی کو پورا کرنے کا موقع ہے۔

یہ مدلل بحث سن کر وہ سب، کچھ اس طرح سے مسکرائے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ انٹرویو کے امتحان میں اوّل نمبر لانے کی وجہ سے منصف اول ہو جانا اب لازمی ہے۔ مگر کئی روز کے بعد اس انٹرویو کا غیر منصفانہ نتیجہ سن کر یقین ہو گیا کہ منصفی کا پوسٹ تو قائم ہے مگر حقیقی معنوں میں دنیا سے منصفی ایک دم اٹھ گئی اور میری طرح تعجب، حیرت، غصہ، افسوس کی قسم سے کئی طرح کی جذباتی کیفیتیں بیک وقت آپ پر بھی طاری ہونے لگیں گی۔ میرے متعلق یہ رائے قائم کی گئی کہ مجھ میں کومن سنس کافی مقدار میں نہیں پایا جاتا۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ ہر شخص کی سمجھ اور سنس جدا ہے۔ "کومن ویلتھ" (Common Wealth) کی طرح کومن سنس کا خود ساختہ اصول بنا کر کسی کی قابلیت اور صلاحیت کا معیار قرار دینا نون سنس قسم کی باتیں ہیں۔

اب ناکامی کے بعد آپ نے سمجھا ہوگا کہ بددل ہو کر میں نے نئے سروس کی کوشش چھوڑ دی ہوگی۔ لاحول ولا قوۃ، وہ کوئی دوسرے بزدل اور پست ہمت کنڈیڈیٹ ہوں گے جو ایک ہی دو بار کی شکست کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ

جاتے ہیں۔ میں مہاتمائی دل و دماغ کا آدمی ہوں۔ بیسیوں بار فیلیور (Failure) ہونے پر بھی اپنی حرکتوں سے باز آنے والا نہیں۔ یہ سروس کمیٹی کیا ہے، بادشاہ تک کے انٹرویو میں فیل ہوجانے کے بعد بھی صرف خود ہی نہیں بلکہ ساتھیوں کو بھی میں یہی مشورہ دیتا رہوں گا کہ

کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

چنانچہ دوسرے سال جب سب رجسٹراری کی خبر ملی تو فوراً بذریعہ رجسٹری درخواست بھیج دی۔ اب حسب دستور جب انٹرویو کے لیے بلایا گیا تو اب کے زبانی امتحان کے بجائے تحریری امتحان شروع ہوگیا اور وہ اس طرح کہ اردو کے صاف خوشخط اور بدخط وثائق کا ایک بنڈل علی الترتیب جو میز پر پہلے ہی سے رکھا گیا تھا اس میں سے ایک ایسا بدخط حروف کا وثیقہ جو بدقسمت کنڈیڈیٹ کے خطِ تقدیر سے بھی زیادہ شکستہ تھا، جسے میں کیا ممتحن صاحبان بلکہ خود لکھنے والا بھی نہیں پڑھ سکتا تھا، نکال کر مجھے پڑھنے کے لیے دیا گیا۔ وہ تو خیریت تھی کہ ایک انٹرویو وہ تجربہ کار کنڈیڈیٹ کے کہنے پر وثیقوں کے ڈھرے اور انداز تحریر سے مانوس ہونے کی غرض سے دو روز پہلے ہی ایک دوست کے یہاں سے لاکر چند پرانے وثیقوں کو صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ دو کو ازبر بھی کرلیا تھا۔ یہی احتیاطی تدبیر اس وقت کام آگئی۔ فوراً اس جناتی حروف کے وثیقہ کو ہاتھ میں لے کر اپنے منھ کے سامنے کرکے اپنے یاد کیے ہوئے وثیقہ کے مضمون کو شینہ کی طرح ایک سانس میں اس طرح دہرایا کہ مارے حیرت کے سب میرا منھ تکنے لگے اور یہ ہمت میں نے اس لیے کی کہ کوشش کرنے پر بھی کسی سے وہ حروف آسانی سے پڑھے نہیں جاتے۔ خیر یہ مرحلہ تو خدا کے فضل سے سر کرلیا۔ اب اس کے بعد دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ ایک دوسرا وثیقہ ناگری حروف میں لکھا ہوا پڑھنے کے لیے پیش کیا گیا۔ اس موقعہ پر پہلی ترکیب تو کام دے نہیں سکتی تھی، کیونکہ میں اردو کے وثیقے یاد کیے ہوئے تھا اور اس کی زبان سنسکرت آمیز بھاشا تھی۔ تھوڑی بہت ہندی جاننے کے باوجود میرے دماغ اور نگاہوں نے پوری قوت کے ساتھ زور آزمائی کی مگر گاڑی آگے نہ چل سکی۔ مجبوراً میں نے دبے لفظوں میں کہا کہ حضور عالی، نحیف اور کمزور انسانوں سے دیوناگری یعنی دیو کے حروف پڑھوانا کہاں تک مناسب ہے۔ اس کے علاوہ کوئی سب رجسٹرار یا رجسٹرار رجسٹری کے وقت خود وثیقہ ''بقلم خاص'' پڑھتا نہیں۔ یہ کام تو پیشکار اور کلرک کا ہے اور میں کلرکی یا پیشکاری کا نہیں بلکہ سب رجسٹراری کا امیدوار ہوں اور یوں ہی مجھ سے پڑھوانے کی ضد ہے تو ایک روز کی مہلت دی جائے۔ یہ ناگری کیا، بنگلہ، اڑیا تک کے وثیقے پڑھ کر بلکہ زبانی یاد کرکے برزبانی سنا دوں گا۔ اس معقول عذر پر معنی خیز تبسم کے ساتھ مجھ سے کہا گیا کہ اس وقت آپ جائیں۔ آئندہ کسی موقع پر یاد کرکے آیئے گا۔ میں سمجھ گیا کہ پھر نیت ان لوگوں کی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس وقت جب کہ جناتی حروف کا وثیقہ نکال کر میرے سامنے پیش کیا گیا تھا، میں اپنے خطِ تقدیر کو پڑھ چکا تھا۔ مگر امید عجیب بلائے بے درماں چیز ہے۔ آنکھ کے دیکھے ہوئے واقعہ اور کان کی سنی ہوئی باتوں کو بھی جھٹلاتی رہتی ہے۔ لیکن خدا بھلا کرے ان ممبران انٹرویو کا کہ اسی وقت میری قسمت کا فیصلہ سنا دیا اور انتظار کی پریشانیوں میں ہفتوں مبتلا نہیں رکھا۔

اس تیسرے انٹرویو کی ناکامی کے بعد میں نے سوچا کہ لاکھ بی۔ اے۔ آنرس یا ایم۔ اے۔ کی اعلیٰ سے اعلیٰ سرٹیفکیٹ بھی ہو جب یہ اونچے درجے کی سرکاری ملازمت کے انٹرویو میں مجھ جیسے بے یار و مددگار کنڈیڈیٹ کو منتخب کرنا سروس کمیٹی کے ممبروں کے لیے ایک بھاری مصیبت ہے۔ اس لیے یہ کہ بچارے فرشتہ تو ہیں نہیں، جنھیں یہ کسی رشتہ ناتہ، نہ بھائی بندی نہ دوستانہ راہ و رسم ہو، آدمیت بھی نہ ہو جب بھی یہ لوگ آخر پیدائشی آدمی ہیں۔ بیسوں اعزا و اقربا، سیکڑوں دوست احباب، ہزاروں ملاقاتی کا ہونا لازم، اور ہر پوسٹ کے امیدوار میں کسی نہ کسی عزیز یا دوست یا ملاقاتی کے لگاؤ کا کنڈیڈیٹ نکل ہی آتا ہے۔ اب ایسے موقعوں پر آدمی اپنے چند روزہ پوزیشن کو دیکھے یا ہمیشہ کے نہ منقطع ہونے والے تعلقات کا خیال رکھے۔ اس خیال کو مدِ نظر رکھ کر میں نے ارادہ کرلیا کہ گزیٹیڈ پوسٹ کا خیال چھوڑ کر اس سے نیچے درجہ کی سرکاری ملازمت کے لیے کوشش کروں۔ مگر شومیٔ قسمت کا کیا علاج کہ ایک خاص قسم کی انسپکٹری کے لیے درخواست دینے پر جب انٹرویو کے لیے بلایا گیا تو آفس میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ انٹرویو کے پہلے کامیاب امیدوار نامزد ہوگیا۔ بقیہ ناکام امیدواروں کو ڈس کوالیفائیڈ (Disqualified) بنانے کے لیے رسماً انٹرویو شروع ہوگیا۔ مدعی کے اظہار کے پہلے ہی اس کے حق میں فیصلہ صادر ہوجانے کی وجہ دریافت کی تو محکمہ کے ایک اہلمد سے معلوم ہوا کہ اس ڈیپارٹمنٹ کے کمشنر کے پرسنل اسسٹنٹ کے اس خاص عزیز کے متعلق پہلے ہی سے طے شدہ بات تھی۔ اب پرسنل معاملہ میں دخل دینا صرف ایٹی کیٹ ہی نہیں بلکہ ''پرسنل لا'' کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے بہ اطمینان شام اپنے گھر واپس چلا آیا۔ اس کے چھ سات ماہ بعد پولیس انسپکٹری کے لیے جب درخواست دی تو:

بہر جا کہ رسیدیم آسماں پیدا است

والا مضمون وہاں بھی تھا۔ یعنی انٹرویو میں سوالات پوچھنے والے اس۔ پی صاحب کے خود حقیقی خالہ زاد ماموں کے سگے لختِ جگر کنڈیڈیٹ کی حیثیت سے موجود۔ ایک تو اس۔ پی کا عزیز، اس پر دیکھنے میں بدن میں ذرا گٹھیلا اور ''ہیلدی'' (Healthy) اس لیے ہر کنڈیڈیٹ سے ورزش اور جسمانی صحت کے متعلق پوچھا جانے لگا۔ مجھ سے بھی جب یہ کہا گیا کہ سب انسپکٹری کے لیے آدمی ہیلدی (Healthy) ہونا ضروری ہے تمھیں ورزش کا شوق ہے یا نہیں؟

میں نے کہا حضور! ورزش نہ کرنے کے باوجود جس کنڈیڈیٹ سے چاہیے پنجہ لڑا دیجیے، پھر دیکھیے اگر چٹ کر بلندی لگانے کے لائق نہ بنادوں تو مہلدی نہ ہونے کی بنا پر میرا نام چھانٹ دیجیے۔ مگر وہاں تو ایک مخصوص مہلدی کنڈیڈیٹ کی ضرورت تھی۔ اس سے مایوس ہو کر آفس کی کلرکی کی طرف میری کوشش کا نزلہ رجوع ہوا۔ مگر وہاں تو ہر محکمہ کے کلرکوں کے اعزا و اقربا جگہ خالی ہونے یا نئے پوسٹ کی ضرورت سے ہی مستقل کنڈیڈیٹ بنے بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہر ہونے والی تقرری کی جگہ پر ناجائز عز رکی حیثیت سے کام بھی کر رہے ہیں۔ اب جس کلرکی کی جگہ کے لیے میں نے درخواست دی ہے، انٹرویو میں پہلا سوال مجھ سے یہی کیا گیا کہ آفس میں اس سے پہلے بھی کام کیا ہے؟ کلرکی کا کچھ تجربہ ہے؟ میں نے کہا کہ جناب کلرکی کا تو نہیں، البتہ کلرکوں کا مجھے سخت تلخ تجربہ ہے۔ جس آفس میں رہوں گا، ممکن نہیں کہ کوئی بغیر علم میرے کسی سے کچھ لے سکے۔ لیکن وہی جو میں نے عرض کیا تھا کہ ہر آفس کے کلرک اپنے محکمے کے آفیسروں پر ایسا چھائے رہتے ہیں اور اپنے یگانوں سے اپنے محکمہ کا راستہ نئے آدمی کے لیے ایسا روکے رہتے ہیں کہ کوئی نیا کنڈیڈیٹ گھسنے بلکہ ادھر جھانکنے کی بھی نیت نہیں کر سکتا۔

مختصر یہ کہ ڈپٹی مجسٹریٹی، منصفی، سب رجسٹراری، سب انسپکٹری مختلف محکموں کی کلرکی کے سلسلے میں اتنے انٹرویوں سے واسطہ پڑا کہ ہر ایک کے اگر تفصیلی حالات لکھوں تو ایک ضخیم "انٹرویو نامہ" ہو جائے۔ اس لیے مختصراً اپنے آخری انٹرویو کے کچھ دلچسپ سوال و جواب کے حالات لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

مسلسل کئی سال تک انٹرویو کے پھیرے میں رہ کر جب قریب اور ایج (Over Age) ہو گیا تو مایوس ہو کر گھر بیٹھ رہا۔ اتفاق سے ایک روز ایک دوست نے کہا" ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ کی ایک نمبر یری جگہ پولیس آفس میں خالی ہے۔ بیکار سے بیگار بھلی۔ تم بھی ایک درخواست پولیس آفس میں دے دو۔

گذشتہ انٹرویو کے تجربات نے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ "انٹرویو سسٹم" جب تک رہے گا ایک کنڈیڈیٹ کو جس کا کوئی سرپرست نہ ہو جگہ ملنی دشوار ہے۔ اس لیے اس امید پر نہیں کہ جگہ مل جائے گی بلکہ محض اس خیال سے کہ

سروں کی ہے امید ہی کس روسیاہ کو
اک گونہ دل لگی ہمیں دن رات چاہیے

ایک آخری انٹرویو کا دلچسپ تماشہ دیکھنے کی غرض سے پولیس آفس میں جا کر بدست خاص ایس. پی. کے ہاتھ میں اپنی درخواست دے دی۔ انھوں نے ایک ہفتہ کے بعد انٹرویو کے لیے طلب کیا۔ حسب الحکم مقررہ تاریخ پر پہنچا تو انٹرویو میں جو سوالات و جوابات ہوئے انھیں بھی آپ ملاحظہ فرمائیں۔

ایس۔ پی: تم کہاں تک انگریزی جانتا ہے؟

میں: حضور میں بی. اے. پاس ہوں۔

ایس. پی.: ہم اتنا ہائی ایجوکیشن والا آدمی نہیں مانگتا۔ ہم کو کھالی (خالی) میٹرک انگریزی جاننے والا کا ضرورت ہے۔

میں: حضور مجھے بی.اے. پاس کیے ہوئے دس سال ہو گئے۔ اس لیے سب بھول گیا۔ اس جگہ کے لیے جتنی انگریزی جاننے کی ضرورت ہے بس اس قدر یاد رہ گئی ہے۔

ایس. پی.: تمھارا فیشن ایبل سوٹ بولتا ہے کہ تم پیسہ والا گھر کا لڑکا ہے۔ تیس روپیہ مہینہ تو تمھارا سوٹ بوٹ کالر ٹائی میں خرچ ہو جانے سکتا ہے۔ اس واسطے تمھارا لائک (لائق) یہ جگہ نہیں۔ گریب (غریب) آدمی کا واسطے ہے۔

میں: غریب پرور یہ سوٹ بوٹ خاص میرا اپنا نہیں۔ یہ انٹرویو کے واسطے دوستوں سے مانگ تانگ کر لایا ہوں ورنہ گھر پر تو:

وہی کرتہ وہی لنگی جو آگے تھی سو اب بھی ہے

ایس. پی.: تم ٹائپ جانتا ہے؟

میں: آپ کے اقبال سے میں ہر قسم کا اور ہر ٹائپ کا انگریزی صرف لکھ پڑھ سکتا ہوں۔

ایس. پی.: تم شوٹ ہینڈ جانتا ہے؟

میں: حضور میرا مائنڈ ایسا زبردست ہے کہ شوٹ ہینڈ کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک بار جو بولنا ہو بول دیجیے اور کل باتیں لکھی ہوئی مجھ سے لے لیجیے۔ اس کے علاوہ میں ایسا "سوئفٹ رائٹر (Swift Writer) ہوں کہ آپ بولنے کے ساتھ ساتھ بلکہ بعض وقت قلم کی روانی منہ سے الفاظ نکلنے ہی کے پہلے لکھا جاتا ہے۔

ایس. پی.: تم تیرنا جانتا ہے؟

میں: اس پوسٹ کے لیے تیراکی جاننے کی شاید اس لیے ضرورت ہے کہ خدانخواستہ کبھی بڑا سیلاب آجائے اور دروازہ پر نو ایڈمیشن لکھے رہنے کے باوجود پانی زبردستی آفس میں گھس آئے تو آفس کے کاغذات کو تیر کر باہر نکالنے کے لیے تیراکی کا جاننا ضروری ہے تو حضور عالی گردن تک پانی میں تو بغیر کشتی تیر کر کاغذات سمیت باہر نکل آسکتا ہوں۔

ایس. پی.: اچھا تم سامنے والا تالاب میں تیرنے سکتا ہے؟

میں: یہ تالاب کیا ہے حضور کا حکم ہو تو سمندر میں کود کر جان دے سکتا ہوں۔

ایس. پی.: تم گھوڑا چڑھنا جانتا ہے؟

میں: حضور گھوڑا چڑھنا کیا چیز ہے، زینہ لگا کر ہاتھی پر چڑھ سکتا ہوں۔

ایس. پی.: پولیس ڈپارٹمنٹ میں تمھارا اپنا آدمی بھی کوئی ہے؟

میں: یوں تو پولیس میں بیسوں میرے اپنے عزیز اور رشتے دار ہیں جن کو

بالفعل میں نہیں جانتا۔ تاہم دو تین شخصوں کے متعلق تو کہہ سکتا ہوں جو اس محکمے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک میرے ماموں جان کے قریبی رشتے کے خالہ زاد بھائی جو داروغہ او رانسپکٹر، نہیں نہیں بلکہ ایک یوروپین ایس۔ پی کے خاص اردلی میں ہیں۔ دوسرے سوتیلی رشتے میں ایک طرح کے قریبی سالے ہوتے ہیں۔ وہ سپاہی سے ترقی کر کے ہیڈ کانسٹبل کے درجے پر پہنچ گئے۔ تیسرے خود افسران پولیس کا یہ کفش بردار خاکسار سروس کا امیدوار آپ کے سامنے موجود ہے ہی۔

ایس. پی.: اچھا اب تم جاسکتا ہے۔

میں: تو پھر اپائنٹمنٹ لیٹر کب تک میرے نام ایشو ہوگا؟

ایس. پی.: آج کا انٹرویو کا بعد اچھا کنڈیڈیٹس کا کل یا پرسوں پھر انٹرویو ہونے مانگتا ہے۔

میں: تو میرے نام دوبارہ انٹرویو کو بھی آج ہی ختم کر دیجیے۔

ایس. پی.: پھاجل (فاضل) بات مت بولو۔ آج دوسرا انٹرویو ہونے نہیں سکتا۔

میں: حضور عالی، اصل بات یہ ہے کہ آج بارہ بجے شب کے بعد میں ''اوراتج'' ہو جاؤں گا۔ آج ٹھیک شب کے گیارہ بج کر 59 منٹ یا زیادہ سے 60 منٹ تک انڈر ایج ہوں۔ اس کے ایک دو منٹ کے بعد اوراتج ہونے کی وجہ سے پولیس کے کام کے لائق نہیں رہوں گا۔ اس لیے وہ انٹرویو بھی آج ہی ختم کر دیجیے۔

ایس. پی.: تمھارا عمر میں بی.اے. پاس کیا اور پاس کیے دس سال ہو گئے۔

میں: 16 سال کی عمر بی.اے. پاس کیا اور پاس کیے دس سال ہو گئے۔

ایس. پی.: ایسا بات ہے تو 26 برس کا تمھارا عمر ہونے مانگتا ہے۔ تم دو برس سے ''اوراتج'' ہے۔

میں: سر، اسکول او رکالج کی عمر کا کوئی اعتبار نہیں۔ دوسری بار کے ''افیڈیوٹ'' (Affidavit) کی رو سے آج بارہ بجے شب تک انڈر ایج ہوں۔

ایس. پی.: ہمارا پاس پھاجل وکت (فاضل وقت) نہیں۔ (کلرک کو مخاطب کر کے) انٹرویو کے واسطے کتنا کنڈیڈیٹ اور ہے؟

کلرک: حضور، تقریباً اور ایک سو کنڈیڈیٹ انٹرویو کے انتظار میں کھڑے ہیں۔

ایس. پی.: او مائی گاڈ، اتنا آدمی کا انٹرویو کا واسطے ہمارا پاس وکت (وقت) نہیں۔ باہر جا کر بول دو انٹرویو کھتم (ختم) ہو گیا۔

کلرک: جب انٹرویو کارڈ ایشو ہو چکا ہے تو بغیر ملاقات واپس چلے جانے پر اخباروں میں بڑا غلغلہ ہوگا۔ یہ انٹرویو تو صرف امیدواروں کی تسلی کے لیے ہوتا ہے ورنہ اپائنٹمنٹ افسروں کی جس پر مہربانی کی نظر ہوتی ہے اسی کو جگہ ملتی ہے۔ باقی رہا جب حضور کے پاس فاضل وقت نہیں اور اس جھنجھٹ کو آج ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں تو بجائے ایک ایک کے پانچ پانچ کنڈیڈیٹ اکٹھے بلا کر ایک دو بات پوچھ بات کر رخصت کر دیجیے۔

ایس. پی.: ول بابو، تم ٹھیک بولتا ہے۔ اَول رائٹ۔ پانچ پانچ کنڈیڈیٹ کا بیچ (Batch) انٹرویو کا واسطے آنے کو بولو۔

صاحب کے حکم کے مطابق پانچ امیدواروں کا پہلا جتھا پریڈ کے قاعدہ سے ''کوئیک مارچ'' کرتا ہوا صاحب کے سامنے حاضر ہو کر فوجی سلام کرنے کے بعد جب صف بستہ کھڑا ہو گیا تو کلرک کا اشارہ پاتے ہی میں باہر چلا آیا اور دروازہ کے پاس پردہ سے لگ کر اس دلچسپ انٹرویو کا تماشہ دیکھنے لگا۔

صاحب: (پانچوں رنگروٹ سے مخاطب ہو کر) تم سب نے انگریزی کتنا پڑھا ہے؟

پہلا: آئی.اے. پاس ہوں۔

دوسرا: بی.اے. کی ڈگری میرے پاس ہے۔

تیسرا: حضور میں بی.اے. آنرز ہوں۔

چوتھا: جناب میں گولڈ میڈلسٹ ہوں۔

پانچواں: میں فرسٹ ڈویژن..... (یہ جملہ پورا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ صاحب نے بگڑ کر کہا) ہمارا پاس پھاجل وکت نہیں۔ تم سب الگ الگ جواب دینے مانگے گا تو ہم کچھ کرنے نہیں سکتا۔ سب کا طرف سے ایک آدمی جواب دینا مانگو۔

سب کی طرف سے ایک نے کہا: حضور ہم سب میٹرک پاس ہیں۔

صاحب: تم سب کا عمر کیا ہے؟

ایک: 21 سال

دوسرا: 20 سال

تیسرا: 22 سال

چوتھا: 23 سال

پانچواں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ صاحب نے ڈپٹ کر کہا

صاحب: ہم بول چکا کہ سب کا طرف سے ایک آدمی بولو۔

پانچواں: حضور ہم سب کی عمر ''انڈر ایج'' ہے۔

صاحب: میٹرک کا آگے تم لوگ اور ''اڈیشنل کوالیفکیشن'' رکھتا ہے؟

پہلا: حضور ہم ٹائپ جانتے ہیں۔

دوسرا: ہم شارٹ ہینڈ جانتے ہیں۔

تیسرا: ہم سائیکل ریس میں فرسٹ ہوئے۔

چوتھا: ہم پولیس آفس میں عوض میں کام کر چکے ہیں۔

صاحب: (غصہ میں) تم سب ہمارا آفیس کو "فش مارکیٹ" بنا دیا۔ پھر تم سب لوگ الگ الگ بولنے لگا۔ "اسپوکس مین" (Spokes Man) فقط ایک آدمی مانگتا ہے۔

پانچواں: (سب کی طرف سے) اس پوسٹ کے لیے جس کوالیفکیشن کی ضرورت ہے اس سے فاضل کوالیفائیڈ ہم لوگ ہیں۔

صاحب: اچھا، ہمارا پاس پھاجل وکت (فاضل وقت) نہیں۔ اب تم لوگ جانے سکتا ہے۔

صاحب: (کلرک سے مخاطب ہوکر) ایسا مالک پانچ پانچ آدمی بھیجا کھانے مانگے گا تو ہم پاگل ہوجائے گا۔ تم باہر والا کنڈیڈیٹ سب کو بول دو اب انٹرویو کا جرورت (ضرورت) نہیں ہے۔ سب لوگ اپنا گھر چلا جائے۔

کلرک: حضور فدوی کی اگر رائے مانی جائے تو چند منٹ کے واسطے باہر تشریف لے چل کر کل کنڈیڈیٹ سے اکٹھے صرف دو دو ایک ایک بات پوچھ کر انٹرویو کا کام ختم کر دیا جائے۔ پھر امیدواروں کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا کہ بغیر انٹرویو واپس چلا دیا گیا۔

صاحب: "اول رائٹ" باہر سب کو ایک جگہ کھڑا ہونے بولو۔

صاحب کے آرڈر کے مطابق آفیس کے باہر سائبان کے نیچے پریڈ کے قاعدے سے سب کے صف بستہ کھڑے ہوجانے کے بعد صاحب آفیس سے باہر تشریف لائے۔ سب نے سینہ تان کر فوجی سلام کیا۔ صاحب نے ہر ایک سے نام پوچھا اور کہا تم لوگ اب اپنا اپنا گھر جانے سکتا ہے۔ ایک ویک (Week) کے بعد بحالی کا حکم دے گا۔

صاحب اس زیارتی انٹرویو کو دو منٹ میں ختم کر کے جب پھر آفیس میں تشریف لائے تو میں بھی دوبارہ کلرک اور صاحب کی گفتگو سننے کو پھر پردے سے لگ کر کھڑا ہوگیا تاکہ اس دل چسپ انٹرویو کے نتیجے کا کچھ اندازہ لگ سکے۔ آفیس کے اندر پہنچ کر صاحب نے کلرک سے کہا۔

صاحب: ول بابو، کمشنر صاحب جس کا واسطے ریکومنڈیشن لکھا ہے اور کلکٹر صاحب جس کنڈیڈیٹ کا واسطے سلپ دیا ہے اور ڈی ایس پی کل جس کے واسطے ہم سے وعدہ لیا ہے، ان سب کا درکھاس (درخواست) ہمارے آفیس بکس میں رکھ دو۔ باقی درکھاس (درخواست) کو فائل کرنے سکتا ہے۔

کلرک: مگر ہر درخواست پر اس کے نامنظور یا فائل کرنے کی وجہ کچھ نہ کچھ لکھ دینا مناسب ہے۔ میں درخواست حضور کے سامنے پیش کرتا جاتا ہوں۔ ہر ایک پر جو نوٹ لکھوانا چاہیں فرماتے جائیں، میں لکھ کر فائل کرتا جاؤں۔

صاحب: (گھبرائے ہوئے لہجے میں) ہمارا پاس وقت نہیں۔ تم اپنا گھر سے نوٹ لکھ کر لائے گا۔ ہم اس پر دستخط کر دے گا۔

کلرک: کچھ تو ہنٹ (Hint) دے دیا جائے کہ پورا کوالیفائیڈ ہونے کے باوجود نامنظور یا فائل کر دینے کے لیے کس قسم کا نوٹ اس پر لکھا جائے۔

صاحب: او، تم اتنا پرانا کلرک اتنا بات بھی نہیں جانتا۔ ہم دو چار بات بتا دیتا ہے۔ اسی مافک لکھتا مانگو۔

(1) سوال کا جواب میں دیر کرتا ہے۔ "انٹلی جنٹ" نہیں ہے۔

(2) یہ ہیلدی (Healthy) نہیں ہے۔

(3) بات کرتا ہے تو بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔

(4) رعب داب والا نہیں ہے۔

یہ سب سن کر اپنی درخواست کا جو حشر ہونے والا تھا اس سے مطمئن ہوکر گھر واپس چلا آیا۔ افسوس "اور اتیج" ہوجانے کی وجہ سے انٹرویو کے پھر دل چسپ تجربات کا اب موقعہ نہیں، ورنہ عمر بھر اس پُر لطف تماشہ سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ راقم

بہر سروس کوشش پیہم سے جی ہارا ہوا
ایک کنڈیڈیٹ انٹرویو کا مارا ہوا

□□□

"کلیات راجندر سنگھ بیدی" — جلد ۲

مرتب: وارث علوی

راجندر سنگھ بیدی اردو فکشن کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کی تحریروں نے قارئین کے بڑے حلقے کو متاثر کیا ہے۔ "کلیات راجندر سنگھ بیدی" کی اس دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے "بے جان چیزیں" اور "سات کھیل" جن میں 11 ڈرامے ہیں، ان کے 29 مضامین جن میں انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات اور تنقیدیں ہیں اس کے علاوہ مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں جو اس کلیات میں شامل ہیں۔ بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون عمدہ ہے جو ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

صفحات — 655، قیمت — 380 روپے

اردو خبرنامہ

اردو: حال اور مستقبل

● جمشید پور۔ 13 اکتوبر، اکتوبر کو انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور کی جانب سے ایک سیمینار بعنوان ''اردو: حال اور مستقبل'' کا اہتمام مائکل جان آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ انجمن کے صدر سید رضا عباس رضوی (محسن) نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں انجمن کے گذشتہ پانچ برسوں کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قومی پیمانے پر جہاں سالانہ حضرت امیر خسرو ایوارڈ اور دیگر اعزازات کا سلسلہ جاری ہے وہیں مذاکرے، سیمینار اور مشاعرے بھی کیے جاتے ہیں جن میں ملک کے مختلف حصوں سے ادبا و شعرا شریک ہوتے ہیں ساتھ ہی ساتھ مقامی ادبا و شعرا کو انعامات و اعزازات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ ایک درجن سے زائد شعری و نثری کتابوں کی رسم اجرا کا اہتمام کیا گیا جو انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور کی بہتر کارکردگی اور فعال ہونے کا بین ثبوت ہے۔

اس سیمینار کے مہمان خصوصی اور مقرر خاص ڈاکٹر علی جاوید (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے کہا کہ ''حال سے زیادہ اردو کا مستقبل روشن ہے، مگر اس کے لیے بنیادی سطح پر سدھار لانے کی ضرورت ہے۔ اردو کی ترقی کے لیے اردو ماڈل اسکول کھولا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آزادی سے پہلے جو انگریزوں کے ایجنٹ ہوا کرتے تھے آج وہی اردو اور ہندی کا جھگڑا کھڑا کر رہے ہیں۔ دراصل اردو اور ہندی کے درمیان جھگڑا پیدا کرکے ہم دو عظیم تہذیبوں کو بانٹنے کی غلطی کر رہے ہیں۔ ہمیں آپس میں تنازع پیدا کرنے کے بجائے مل بیٹھ کر فرقہ وارانہ طاقتوں کے خلاف لڑنے کی ضرورت ہے۔ اردو کے بغیر ہندی اور ہندی کے بغیر اردو کی ترقی ممکن نہیں۔''

مہمان اعزازی ابوذر عثمانی (صدر، جھارکھنڈ انجمن ترقی اردو ہند) نے کہا کہ آزادی کے بعد اردو سیاست کا شکار ہوگئی ہے۔ اردو زبان کو مذہب سے نہیں جوڑا جانا چاہیے۔ انھوں نے گجرال کمیٹی کی رپورٹ جو اردو زبان کے سلسلے میں ہے، اس پر عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اس پروگرام میں مہمان خصوصی ڈاکٹر علی جاوید کو انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور کی جانب سے ایک مومینٹو، سپاس نامہ اور شال پیش کیا گیا۔ مہمان اعزازی ابوذر عثمانی کو بھی شال پیش کیا گیا۔ پروگرام کی تیاریوں میں انور ادیب، ممتاز شارق، جاوید اختر انصاری، علی رضا اور راجو خان کے علاوہ انجمن کے سرگرم نمائندے کئی دنوں سے مصروف تھے۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں ٹاٹا اسٹیل کارپوریٹ کمیونیکیشن کے چیف مسٹر جے چودھری کا تعاون خاص شامل رہا۔

اس موقعے پر مہمان اعزازی ای۔ پی۔ آر۔ نائیر بھی موجود تھے۔ نظامت کے فرائض انور ادیب نے نبھائے۔ اظہار تشکر ڈاکٹر زکریا (پرنسپل کریم سٹی کالج) نے کیا۔ ممتاز شارق، جاوید اختر انصاری اور جاوید صدیقی نے مہمانوں کی گل پوشی کی۔ اس موقعے پر شہر و اطراف کے خواتین و حضرات، مختلف کالجوں کے طلبہ و اساتذہ، ادبی، سماجی و سیاسی تنظیموں کے عہدے داران اور اردو دوستوں کی کافی تعداد موجود تھی، جن میں ڈاکٹر سید صفدر رضی، رضوانہ ارم، جے نندن جی، کے۔ بی۔ رجک، نیرنجن سنگھ گنگ، پی۔ اے۔ کانت، کے۔ سنگھ، آنند مشرا، اشوک، سوریش، سید منصور عالم، اسلم بدر، ڈاکٹر افسر کاظمی، ڈاکٹر شمس الحق، منظر کلیم، ناصر راہی، رضوان اورنگ آبادی، نصر فردوسی، آفتاب عالم پپو، وغیرہ خاص ہیں۔ (ڈاک سے)

ہندی کی سب سے بڑی طاقت اردو
اور اردو کی سب سے بڑی طاقت ہندی ہے

● واشنگٹن۔ 10 ستمبر، ہندی کی سب سے بڑی طاقت اردو ہے اور اردو کی سب سے بڑی طاقت ہندی۔ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اردو ہے۔ جتنا گہرا رشتہ اردو اور ہندی میں ہے شاید دنیا کی کسی دوسری زبانوں میں نہیں۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے پیدا ہوئیں۔ اگرچہ ہندی اپنا فیضان سنسکرت سے اور اردو پراکرتوں کے علاوہ عربی اور فارسی سے حاصل کرتی ہے تاہم نسبتی اعتبار سے دونوں میں گہرا لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔ واشنگٹن یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایلیٹ ہال میں منعقدہ ایک پروقار جلسے میں ''ہندی اردو کے لسانی رشتے'' پر خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان خیالات کا اظہار کیا۔

انھوں نے ہندی اردو کے لسانی رشتے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دونوں زبانوں کا جدامجد اڈک ہے۔ جب آریہ ہندوستان آئے تو وہ اڈک بولتے تھے۔ دسویں اور گیارھویں صدی میں مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے ہندوستان کے تہذیبی اور لسانی نقشے میں بھی تیزی سے تبدیلیاں ہوئیں۔ عربی، فارسی اور ترکی کے اثر سے ہزاروں نئے لفظ اپ بھرنشوں میں داخل ہونے لگے اور پھر آپسی لین دین اور روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے ایک ملی جلی ریختہ

زبان سامنے آئی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب غزنویوں کے بعد غوریوں کی حکومت شروع ہوئی تو راجدھانی دہلی قرار پائی۔ اس سے ہندی اور اردو زبان کی ملی جلی ابتدائی تاریخ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ دہلی کے گردونواح میں اس زمانے میں شورسینی کی جو قدیم بولیاں رائج تھیں ان میں کھڑی، ہریانی اور برج خاصی اہم تھیں۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ ہندی اور اردو کے مشترک نشوونما کی تیسری کڑی اس نئی ملی جلی زبان کا تیرھویں اور چودھویں صدی میں دکن پہنچنا تھا۔ چودھویں سے سولھویں صدی تک یہ زبان شمالی ہندوستان کی ریختہ کے مقابلے میں گجری اور دکنی کہلاتی تھی۔ دکن کے مقابلے شمالی ہند میں ہندی اور اردو کو پوری طرح سامنے آنے میں انتظار کرنا پڑا، کیونکہ سرکاری زبان فارسی تھی۔ پھر بھی عوامی ضرورتوں سے نئی ریختہ زبان کی نشوونما جاری رہی۔ بعد میں اس نئی زبان کو جسے کبھی ہندوی، کبھی ریختہ اور کبھی دکنی کہا جاتا تھا، اب اردو کہا جانے لگا۔ بہتوں نے اسے زبانِ ہندوستان بھی لکھا ہے۔ اسی نسبت سے ہندوستان کی بولی ہندی کہلائی۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور اردو اگرچہ دو الگ الگ زبانیں بن گئیں لیکن دونوں کا معیاری روپ ''کھڑی'' پر قائم ہے۔

جلسے کے آغاز میں واشنگٹن یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف ایشین لینگویج اینڈ لٹریچر کے چیئرمین پروفیسر کیشاورز نے پروفیسر نارنگ کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا جبکہ آخر میں ڈاکٹر ایم جے وارثی نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں اسکالر، طلبہ وطالبات اور فیکلٹی ممبر موجود تھے۔

(ڈاک سے)

ہندی اردو افسانوی ادب کی زبان پر ورکشاپ

● علی گڑھ۔ 16 اکتوبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے زیر اہتمام ''ہندی اردو افسانوی ادب کی زبان'' پر منعقدہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے کہا کہ ہندی اردو افسانوی ادب میں زبان کی سطح پر بہتری لانے کے لیے دونوں زبانوں کے دانشوروں کو مشترک میدانوں میں مل جل کر کام کرنے کے امکانات تلاش کرنے چاہئیں۔ دونوں زبانوں میں مشترک طور پر کام کرنے کے لامحدود امکانات موجود ہیں۔ وائس چانسلر نے کہا کہ افسانوی ادب کی تخلیق کے وقت اس میں زبان کا حسن برقرار رہنا چاہیے تاکہ آخر تک قاری کی دلچسپی قائم رہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے اے ایم یو کے شعبۂ انگریزی میں پروفیسر ایمریٹس پروفیسر فرحت اللہ خاں نے کہا کہ دورِ حاضر میں ہندی اردو افسانوی ادب کی زبان تنزل کا شکار ہوئی ہے۔ قلم کاروں کو ادبی اور غیر ادبی زبان میں فرق کرنا ہوگا اور زبان کو سہل بنانے کی جگہ اس کے وقار کو برقرار رکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ زبان کا حسن ہمیشہ قاری کو متاثر کرتا ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ ادب میں زبان کے استعمال پر اس سیمینار میں نئی چیزیں ابھر کر سامنے آئیں گی۔ اردو کے ممتاز شاعر اور پروگرام کے اعزازی مہمان پروفیسر شہریار نے کہا کہ دورِ حاضر میں بھی اردو میں اعلیٰ معیاری ادب تخلیق کیا جارہا ہے اور اردو ملک کی ترقی پذیر زبانوں میں سے ایک ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب میں زبان کی کافی اہمیت ہے اور ادیب کا سب سے بڑا ہتھیار بھی زبان ہی ہے۔ اردو کے افسانوی ادب میں وقت وقت پر مختلف تجربات ہوتے رہے ہیں اور اردو میں پوری ذمے داری و ایمانداری کے ساتھ لکھا جارہا ہے۔ انھوں نے فلموں اور ٹی.وی. سیریلوں میں پیش کیے جانے والے ادب پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غوروفکر کی ضرورت ہے کہ یہ دونوں وسائل فکشن کو کس سمت میں لے جارہے ہیں اور کون سی نئی تہذیب کو پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں اپنا ایک شعر بھی پیش کیا:

طویل ہونے لگی ہیں اس لیے راتیں
کہ لوگ سنتے سناتے نہیں ہیں کہانی

اپنے صدارتی خطبے میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ افسانوی ادب کی زبان شاعری کی زبان سے مختلف ہوتی ہے اور یہاں محض تشبیہات و استعارات سے کام نہیں چلتا۔ افسانوی ادب کی زبان سماجی و ثقافتی سروکاروں کے اردگرد گھومتی ہے اور ثقافتی سروکاروں کے وسیلے سے خود کو قائم کرتی ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ ادب کی زبان عام زبان سے الگ ہوتی ہے مگر وہ عام فہم ہونی چاہیے۔ اس سے قبل حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے شعبۂ لسانیات کے سربراہ پروفیسر اے آر فتیحی نے کہا کہ اس سیمینار کا مقصد یہ ہے کہ صرف اعلیٰ سطح ہی نہیں بلکہ نچلی سطح پر بھی زبان کے استعمال پر گفتگو کی جاسکے۔ پروفیسر فتیحی نے کہا کہ ہندی اردو فکشن میں زبان پر مختلف قسم کے تجربات کیے جارہے ہیں۔ اس سیمینار کا اصل مقصد افسانوی ادب کی زبان پر ہر پہلو سے غوروفکر اور اس میں بہتری کے پہلو تلاش کرنا ہے۔ نظامت کے فرائض شعبۂ لسانیات کے سینئر استاد ڈاکٹر مسعود علی بیگ نے انجام دیے اور تحقیق کی طالبہ ناہید صبا نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (اخبار مشرق، دہلی)

مشینی ترجمے کے ذریعے 90 فیصد درست ترجمے کا امکان

● حیدرآباد۔ 26 ستمبر، دفتری، قانونی اور لفظی ترجمے کی حد تک مشینی ترجمہ 90 فیصد تک صحیح ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد اس کی تصحیح کے لیے افراد کی ضرورت ہوگی۔ فی الوقت مشین کے ذریعے ادبی ترجمہ مشکل ہے۔ ان

خیالات کا اظہار آج پروفیسر کے کے گوسوامی، ریٹائرڈ پروفیسر دہلی یونیورسٹی نے شعبۂ ترجمہ کے اساتذہ کے ساتھ ایک علمی مذاکرے کے دوران کیا۔ مشینی ترجمے کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس سے کام میں تیزی پیدا ہوسکتی ہے لیکن ترجمے میں مترجمین کی ضرورت ختم نہیں ہوگی۔ مشین کی حیثیت ہمیشہ ایک جونیئر مترجم کی رہے گی جس کی تصحیح کے لیے سینئر مترجم کی حیثیت سے انسانی وسائل ضروری ہوں گے۔ پروفیسر گوسوامی مختلف یونیورسٹیوں میں ترجمے کی تدریس سے وابستہ رہے ہیں اور اس وقت CDAC میں ہندی انگریزی کے مشینی ترجمے کے پراجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ اپنی گفتگو میں پروفیسر گوسوامی نے بتایا کہ اس وقت IIT کانپور کے اشتراک سے ہندی انگریزی کے علاوہ اردو انگریزی اور پنجابی انگریزی کے بھی مشینی ترجمے کی تیاری کا کام انجام پارہا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں قائم شعبۂ ترجمہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے علاوہ صرف ہماچل پردیش یونیورسٹی میں ہی ایم اے ٹرانسلیشن کا کورس موجود ہے۔ اس کے علاوہ ترپوندرم یونیورسٹی میں بھی دو سالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس چلایا جارہا ہے۔ کسی اور جامعہ میں علاحدہ سے شعبۂ ترجمہ قائم نہیں ہے۔ مختلف جامعات میں زبانوں کے شعبہ جات کے تحت ایک سالہ ڈپلوما کورس چلایا جارہا ہے۔ اردو انگریزی مشینی ترجمے کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ اب تک صرف 40 فیصد کام ہوسکا ہے جب کہ ہندی انگریزی مشینی ترجمے کا کام 70 فیصد تکمیل پاچکا ہے۔ ابتدا میں صدر شعبۂ ترجمہ پروفیسر محمد ظفرالدین نے پروفیسر گوسوامی سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کا اجمالی تعارف کروایا۔ صدر شعبہ کے علاوہ شعبۂ ترجمہ کے اساتذہ جناب محمد جنید ذاکر، جناب فہیم الدین اور ڈاکٹر کہکشاں لطیف نے مباحثے میں حصہ لیا۔ (ڈاک سے)

ماہنامہ "شگوفہ" کی 40 سالہ سالگرہ

● حیدرآباد۔ نومبر 2008 میں شگوفہ کے 40 سال مکمل ہوجائیں گے۔ اس ضمن میں اولین پروگرام کے طور پر مدارس اور کالجز کے طالب علموں کے لیے ادبی مقابلوں کا اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد پر انعقاد عمل میں آیا جن میں تین دن تک مدارس اور کالجوں کے طلبہ کی کثیر تعداد شریک رہی۔ اول، دوم، سوم مقام حاصل کرنے والے طالب علموں کو بالترتیب 1000 روپے، 500 روپے اور 300 روپے بہ طور انعامات دیے گئے۔ ان کے علاوہ ادارہ شگوفہ اور انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی جانب سے ترغیبی انعامات بھی دیے گئے۔ ان ادبی مقابلوں کے نتائج کی تفصیل درج ذیل ہے۔

بین مدارس تحریری مقابلہ عنوان "اپنے منہ میاں مٹھو"

سیدہ دانیا بانو، تکرم جاہ ہائی اسکول، انعام اول، فردوس اقبال، گلینڈل ہائی اسکول، انعام دوم، جویریہ صباحت، ورشھوار ہائی اسکول، انعام سوم، ترغیبی انعام، زین علیم، گلینڈل اکادمی، محمد بشیر، اردو ماڈل اسکول، حمایت نگر۔

بین کلیاتی تحریری مقابلہ بہ عنوان "نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے"

تنویر فاطمہ، بی اے سال دوم انوارالعلوم کالج، انعام اول، سید وسیم، بی۔ اے۔ سال سوم اردو آرٹس کالج، انعام دوم، محمد چاند پاشاہ، بی کام سال دوم اردو آرٹس کالج، انعام سوم، ترغیبی انعام، ذہین سلطانہ، گورنمنٹ ڈگری کالج حسینی علم، سمیرہ سلطانہ، انوارالعلوم کالج۔

بین مدارس تقریری مقابلہ بہ عنوان "ٹی وی ایک خوبصورت بلا"

صبرین، گلینڈیل اکادمی، انعام اول، الہام عرشیہ، تکرم جاہی ہائی اسکول، انعام دوم، نوشین فاطمہ، اردو ماڈل ہائی اسکول، انعام سوم، ترغیبی انعامات، سید نزل اکبر، تکرم جاہ ہائی اسکول، فرحت، گلینڈل اکادمی، محمد عبدالعزیز، مدینہ ہائی اسکول۔

بین کلیاتی تحریری مقابلہ بہ عنوان "اٹھو میری دنیا کے لیڈروں کو جگادو"

محمد اکبر، ممتاز کالج، انعام اول، مسرت بیگم، انوارالعلوم کالج، انعام دوم، سید وسیم، اردو آرٹس کالج، انعام سوم، ترغیبی انعام، اُم ہانی۔

بین مدارس لطیفہ گوئی— اُم انیس، گرلز ہائی اسکول معظم جاہی مارکیٹ، انعام اول، فیض النساء بیگم، گورنمنٹ ہائی اسکول مشیرآباد، انعام دوم، نسیم بیگم، صفدریہ گرلز ہائی اسکول، نکہت بانو، اردو ماڈل اسکول۔

بین کلیاتی لطیفہ گوئی— مسرور جمیل، انوارالعلوم کالج، انعام اول، تنویر فاطمہ انوارالعلوم کالج، انعام دوم، مسرت بیگم، انوارالعلوم کالج، انعام سوم۔

بین مدارس ممکری— محمد عادل، مارٹینیٹ اسکول مشیرآباد، انعام اول، عبدالرحمٰن، مارٹینیٹ اسکول مشیرآباد، انعام دوم، عمر جاوید وحمزہ امام، گلینڈیل اکادمی، انعام سوم

ترغیبی انعام— یاسمین سلطانہ، گرلز ہائی اسکول معظم جاہی مارکیٹ۔

بین کلیاتی ممکری— این ارشاد، ڈی ایڈ کالج اردو یونیورسٹی، انعام اول، عبدالرحیم، نظامیہ طبیہ کالج، انعام دوم، سید رحیم الدین، آئی سی ایف اے کالج، انعام سوم۔

بین کلیاتی بیت بازی مقابلہ— انعام اول، آر بی وی آر ریڈی کالج، ترنم فاطمہ عائشہ حمیرہ اور صفیہ کوثر پر مشتمل ٹیم، انعام دوم انوارالعلوم گرلز کالج۔ صالحہ بیگم، رقیہ فاطمہ اور صوفیہ کوثر پر مشتمل ٹیم۔ ترغیبی انعام، ترنم فاطمہ، ریڈی ویمنس کالج، مسرت بیگم، انوارالعلوم کالج، عبدالرحیم، اردو آرٹس کالج،

21 اگست کو 4 بجے شام تقسیم انعامات کے جلسے میں مندرجۂ بالا انعامات کی تقسیم عمل میں آئی۔ (ڈاک سے)

گورنمنٹ کالج مالیرکوٹلہ میں اردو تعلیمی مرکز کا قیام

● مالیرکوٹلہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے گورنمنٹ کالج مالیرکوٹلہ کے شعبۂ اردو میں قائم کیے گئے اردو تعلیمی مرکز میں ایک اہم تقریب منعقد کی گئی جس میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لائے۔ دہلی سے نوجوان صحافی جناب آصف اعظمی کے علاوہ مالیرکوٹلہ کے اردو قلمکاروں، شاعروں اور محبانِ اردو نے خصوصی طور پر تقریب میں شرکت فرمائی۔

کالج کے پرنسپل پروفیسر عبدالسلام نیازی نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے شعبۂ اردو کی اطمینان بخش پیش رفت پر اظہار مسرت کیا۔ کالج کے شعبۂ اردو کے صدر اور تعلیمی مرکز کے نگراں ڈاکٹر محمد اقبال نے تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر علی جاوید کا حاضرین سے تعارف کراتے ہوئے شعبۂ اردو کی نمایاں حصولیابیوں پر بھی روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ سالِ رواں میں مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے 73 طلبہ اردو ڈپلوما کورس میں داخل ہوئے ہیں جن کی رہنمائی کے لیے شعبۂ اردو میں مناسب انتظام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ چمن اردو کی آبیاری تمام مذاہب کے لوگوں نے کی ہے اور اس تعلیمی مرکز کے طلبہ کا تعلق بھی تمام مذاہب سے ہے جو اس شیریں زبان کے گنگا جمنی مزاج کی تصدیق کرتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے اردو ڈپلوما کے طلبہ سے کہا کہ وہ صرف ڈپلوما حاصل کرنے تک ہی اپنے آپ کو محدود نہ کریں بلکہ ان اقدار و خصوصیات کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں جن کے لیے اردو زبان پورے عالم میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اردو مرکز کے یہ 73 طلبہ پنجاب میں اردو کی ترویج و فروغ کے لیے نمایاں رول ادا کریں گے۔

تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر علی جاوید نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان انسانیت کی زبان ہے اس پر کسی خاص فرقے یا مذہب کی کوئی اجارہ داری نہیں۔ انھوں نے اردو زبان کی وسیع المشربی اور انسانی اقدار سے اس کی وابستگی کو متاثر کن انداز سے پیش کیا۔ ڈاکٹر علی جاوید نے فرمایا کہ اردو زبان نے جبر، تشدد، ناانصافی اور ظلم کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔ انھوں نے اردو شاعروں اور نثر نگاروں کے حوالے سے اردو کے احتجاجی لب و لہجے کو نمایاں کرتے ہوئے اردو ادب کی فراخدلی اور تنوع پر بھی روشنی ڈالی اور مالیرکوٹلہ کالج کے شعبۂ اردو کو پنجاب میں اردو کے فروغ کے لیے نمایاں خدمات انجام دینے کے لیے مبارکباد پیش کی نیز یقین دلایا کہ قومی اردو کونسل، فروغ اردو کی تمام کوششوں میں شعبۂ اردو کے ساتھ تعاون کرے گی۔ اس موقع پر مہمان خصوصی کے دست مبارک سے اردو ڈپلوما کورس کے طلبہ کو نصابی کتب بھی تقسیم کی گئیں۔ شعبۂ اردو کی جانب سے ڈاکٹر علی جاوید کی اردو زبان و ادب کے تئیں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اعزاز و اکرام بھی کیا گیا۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر منظور حسن نے تقریب کی نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔

(ڈاک سے)

اساتذہ کا تربیتی کیمپ

● شولاپور۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر لکھنؤ اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام شولاپور میں ایک تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس کا افتتاح ایڈوکیٹ عمر خان بیریا نے کیا۔ انھوں نے اساتذہ کو نئی تکنیک سے تدریسی طریقوں کو عمل میں لانے کی اپیل کی۔ جناب وقار احمد شیخ رکن مہاراشٹر اردو اکادمی نے اس موقعے پر کہا کہ تعلیم اور ادب ایک سکے کے دو رخ ہیں معیاری ادب کے لیے معیاری تعلیم بے حد ضروری ہے۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر لکھنؤ کے پرنسپل ڈاکٹر مہاراج کشن کول نے کہا کہ معلم قوم کا معمار ہوتا ہے۔ اس کی ایمانداری اور اپنے پیشے سے لگاؤ قوم کے تابناک مستقبل کی ضامن ہے۔ ملک میں اردو مدارس میں مہاراشٹر سرفہرست ہے۔ اس کا کریڈٹ یہاں کے اساتذہ کو جاتا ہے۔ اس کیمپ میں مندرجۂ ذیل موضوعات پر ماہرین تعلیم نے اساتذہ کی رہبری کی۔

ڈاکٹر کول: صوتیات، اعضائے تکلم، ٹیچنگ میتھاڈولوجی، حروف تہجی کی شناخت۔ لسانیات۔ اردو زبان کی تاریخ، اردو رسم الخط۔

بشیر پرواز صاحب: نظم کی تدریس اور اردو خوش نویسی، اعجاز نبی کاریگر: املا و انشا اور اردو شاعری، شفیع چوبدار: ہم نصاب سرگرمیاں اور اسکول لائبریری، اخلاق شیخ: اقدار تعلیم، وقار احمد شیخ: شخصیت کا ارتقا، ڈاکٹر نعیم پیرزادہ: تدریس کے نئے طریقے۔

اس موقعے پر ضلع پریشد شولاپور کے ناظر تعلیمات اسحاق منیار موجود تھے۔ عثمان آباد ضلع پریشد کی محترمہ تبسم سلطانہ نے بھی اساتذہ کی رہبری کی۔ چھ روزہ اس تربیتی کیمپ کا انعقاد شولاپور مہانگر پالیکا اردو کیمپ ہائی اسکول میں کیا گیا۔ (ڈاک سے)

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی ایک اہم کامیابی

● مظفر نگر۔ 18 اکتوبر، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ضلع صدر کلیم احمد تیاگی نے کریلی پوسٹ آفس الہ آباد کے ذریعے اردو زبان میں کاٹی گئی اسپیڈ

پوسٹ/ رجسٹری رسید کی فوٹو کاپی میڈیا کو دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم اردوداں عوام اپنے آئینی حقوق کا استعمال کرنے کے لیے بیدار ہو جائیں تو وہ دن دور نہیں کہ سرکاری ملازمت میں ہماری تعداد وہی ہو جائے گی جو آزادی سے قبل تھی۔ کلیم احمد تیاگی نے کہا کہ مگر ہم اردوداں مصنف، پروفیسر، ریڈر، لیکچرر، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، تاجر، شاعر، ادیب، مراسلہ نگار اور تعلیم یافتہ عوام احساس کمتری کا شکار ہیں اور مرکزی حکومت کے دفاتر یا ریاستی حکومت کے دفاتر میں دوسری سرکاری زبان علاقائی زبان میں درخواست دینے یا اردو میں فارم بھرنے، خطوط میں پتہ اردو میں لکھنے سے گھبراتے ہیں تو حکومت اپنے دفاتر میں اردو تعلیم یافتہ ملازمین کیونکر مقرر کرے گی اور سرکاری ملازمت کے لیے تعلیمی لیاقت میں اردو کا علم کیونکر لازم کیا جائے گا۔ کلیم تیاگی نے کہا کہ آج کا تعلیم یافتہ مسلمان اپنے آپ کو سیکولر کہلانے کے لیے اپنی زبان ''اردو'' کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ آج کل کا نوجوان اردو جانتے ہوئے بھی انگریزی زبان کا استعمال کرنے میں فخر محسوس کر رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تنظیم کے اراکین اردو میں انکم ٹیکس فارم بھرکر، بینک اکاؤنٹ اوپننگ فارم اردو میں بھرکر، چیک اردو میں کاٹنے کے ثبوت وغیرہ اخبارات کے توسط سے اردوداں عوام تک پہنچا چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا آئینی حق ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اردوداں عوام میں کوئی بیداری نظر نہیں آرہی ہے۔ کلیم احمد تیاگی نے اردوداں عوام سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو صرف ادب تک اور اپنی روزی روٹی تک ہی محدود نہ کریں بلکہ سرکاری دفاتر میں اردو کا استعمال کرنے کی جسارت کریں تا کہ حکومت کو اردو تعلیم یافتہ بیروزگاروں کے لیے پوسٹ نکالنے کے لیے مجبور ہونا پڑے اور تنظیم کا مقصد مکمل ہو سکے۔ (صحافت، دہلی)

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی شکایت

● الٰہ آباد۔ 18 اکتوبر، ''اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن'' نے اسٹیٹ بینک آف انڈیا پر الزام عائد کیا ہے کہ اس کے اعلیٰ افسران دوسری سرکاری زبان اردو میں لکھی درخواست کا جواب ہندی زبان میں دے کر ''یوپی آفیشیل لینگویج (امنڈمنٹ) ایکٹ 1989 کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ تنظیم کے مطابق اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش، دہلی اور جھارکھنڈ میں اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی شاخیں اپنا سائن بورڈ بھی اردو میں نہیں لکھوا رہی ہیں جبکہ ان پانچوں ریاستوں میں وہاں کے ایوانوں سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا حق دے دیا گیا ہے۔

اسٹیٹ بینک آف انڈیا ''لوکل ہیڈ آفس'' لکھنؤ کے چیف منیجر کا ایک خط میڈیا کو مہیا کراتے ہوئے تنظیم کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والے نے یہاں جاری ایک بیان میں کہا کہ حق اطلاعات قانون 2005 کے تحت ان کی اپیل کا جواب دیتے ہوئے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے چیف منیجر نے اپنے خط (مورخہ 16-9-08) میں لکھا ہے کہ سینٹرل پبلک انفارمیشن افسر کے ذریعے اپیل کنندہ کی درخواست مورخہ 24-3-08 کا جواب ہندی زبان میں دینے کے سبب ایکٹ کے پرووِیژنوں کا وائلیشن نہیں ہوا ہے جبکہ میرا ماننا ہے کہ قانون شکنی ہوئی ہے۔ کیونکہ قانون یہ کہتا ہے کہ ''اردو میں دی گئی درخواست کا جواب اردو میں دیا جائے گا'' اور ایسا نہ کرنا یقیناً حق اطلاع ایکٹ کی قانون شکنی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

کالجوں میں اردو اساتذہ کی تعیناتی کا مطالبہ

● باغپت۔ 21 ستمبر، لوک دل کارکنان کی ایک میٹنگ بروت میں محلہ شورگران میں منعقد ہوئی۔ میٹنگ میں ارشد چودھری نے کہا کہ صوبائی سرکار کے انٹر اور ڈگری کالجوں میں اردو ٹیچر تعینات نہ کرنے کی بنا پر اردو داں طبقے میں ناراضگی ہے۔ انھوں نے سبھی کالجوں میں اردو ٹیچر تعینات کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

دوسری طرف آل انڈیا اردو تنظیم نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ تمام سرکاری پرائمری اسکولوں سے اردو تعلیم کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں جب پرائمری سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام ہی نہیں ہے تب کالجوں میں اردو پڑھنے والے طلبہ کہاں سے آئیں گے۔ اس لیے اردو ٹیچروں کی تقرری کی جائے۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ودربھ مسلم گورو پرسکار

● ناگپور۔ ودربھ مسلم فورم اور شاداب ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام یہاں شکشک سہکاری بنک ہال میں ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس این پٹھان کی صدارت میں یونین پبلک سروس کمیشن کی رکن ڈاکٹر پروین طلحہٰ کے ہاتھوں ودربھ کے 58 مسلمانوں کو ادب، صحافت، تعلیم، کھیل کود، سماجی امور اور فنون لطیفہ میں نمایاں کارکردگی انجام دینے پر ''ودربھ مسلم گورو پرسکار'' سے نوازا گیا۔

بچوں کے رائٹر وکیل نجیب، ڈاکٹر اشفاق احمد، نامور ادیب ڈاکٹر محمد اسداللہ، صحافی نثار اختر انصاری اور حمیرہ مریم کو ان کی خدمات کے لیے یہ ایوارڈ پیش کیے گئے۔ تعلیمی میدان میں سرگرمی کے لیے ڈاکٹر شکیل ستار،

پروفیسر اسلم باری، حاجی ظفر احمد خان اور ناظرہ پٹیل کو دور بھ مسلم گورو پرسکار سے نوازا گیا۔

مفسر قرآن کریم پدم بھوشن مولانا عبدالکریم پاریکھ کو بعد از وفات یہ ایوارڈ پیش کیا گیا جو ان کے فرزند حاجی عبدالحمید پاریکھ نے حاصل کیا۔ اس موقعے پر حکومت مہاراشٹر کے سابق وزرا پروفیسر خان اظہر حسین، رنجیت دیشکھ، محمد حسین دلوائی، ایس آر پی ایف کے کمانڈر قیصر خالد، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن الحاج عبدالوہاب پاریکھ سمیت دور بھ کی نامور مسلم ہستیاں موجود تھیں۔ پروگرام کے کنوینر ایم آر خان نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور نذیر احمد فرحت نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

''آزاد ہند میں اردو صحافت'' جلد منظر عام پر

● بھوپال۔ اردو کے سینئر صحافی عارف عزیز کی 9 ویں کتاب ''آزاد ہند میں اردو صحافت'' پندرہ ماہ کی شب و روز کی محنت کے بعد طباعت کے لیے تیار ہے۔ یہ کتاب ان کی 1947 سے 2006 کے درمیان کی ساٹھ سالہ اردو صحافت پر تحقیقی کام ہے۔ 520 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پہلے باب میں اخبارات کی اہمیت کے ساتھ 19 ویں صدی اور 20 ویں صدی کے نصف اول کی اردو صحافت کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے باب میں آزاد ہندوستان کی ساٹھ سالہ صحافت کے جائزے کے تحت 1947 سے 2006 کے درمیان ملک کی پندرہ ریاستوں سے شائع ہونے والے قابل ذکر اخبارات بالخصوص روزناموں اور ہفت روزہ اخبارات کے ارتقا کا احاطہ کیا گیا ہے جبکہ تیسرے باب میں ادبی صحافت، مزاحیہ صحافت، مرکزی و ریاستی حکومتوں کے رسائل، اکادمیوں کے ترجمان، مذہبی و علمی مجلات، اخبارات میں کارٹون کا استعمال، خواتین کی صحافت، سائنسی صحافت، فلمی صحافت اور بچوں کے رسائل کے کردار کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچواں باب اردو اخبارات اور ان کے صفحات پر پیش کیے جانے والے مسائل کے لیے مخصوص ہے اور چھٹے باب میں اردو کے 10 معتبر و ہمہ رنگ صحافیوں کی شخصیت اور کارناموں کا تعارف ہے۔ آزادی کے بعد کے ہندوستان کی اردو صحافت پر اپنی نوعیت کا یہ پہلا کام ہے جو عارف عزیز نے ماکھن لال چترویدی نیشنل صحافتی اور مواصلاتی یونیورسٹی بھوپال کے شعبۂ تحقیق کے ایک پروجیکٹ کے تحت مکمل کیا ہے۔

(ڈاک سے)

محترمہ سیدہ حمید اردو یونیورسٹی کی چانسلر مقرر

● حیدرآباد۔ 26 ستمبر، صدر جمہوریہ ہند محترمہ پرتبھا پاٹل نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر کے عہدے پر محترمہ سیدہ سیدین حمید کا تقرر کیا ہے۔ محترمہ پرتبھا پاٹل، اردو یونیورسٹی کی وزیٹر ہیں۔ محترمہ سیدہ حمید، حکومت ہند کے منصوبہ بندی کمیشن کی رکن ہیں۔ انھیں تین سالہ میعاد کے لیے جس کا آغاز 9 جولائی 2008 سے ہو چکا ہے اردو یونیورسٹی کا چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔ محترمہ سیدہ حمید نے اس باوقار عہدے پر ممتاز سائنسداں پروفیسر عبید صدیقی کی جگہ لی ہے جو یونیورسٹی کے دوسرے چانسلر کی حیثیت سے اس عہدے پر فائز تھے۔ جناب آئی کے گجرال، سابق وزیر اعظم ہند یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر مقرر کیے گئے تھے۔ (ڈاک سے)

ادب کا نوبل انعام فرانسیسی ادیب جین میری کے نام

● اسٹاک ہوم۔ فرانسیسی ادب جین میری گستاولی کلیزیو نے 2008 کا نوبل ادب انعام جیت لیا ہے۔ یہ اطلاع انعام دینے والی کمیٹی نے دی ہے۔ ایک کروڑ سویڈش کراؤن تقریباً 14 لاکھ ڈالر کا انعام دینے والی سویڈش اکادمی نے لی کلیزیو کے مہم جویانہ ناولوں، مضامین اور بچوں کے ادب کو سراہا ہے۔ اکادمی کا کہنا ہے کہ جین میری نئے تصورات، ادبی تنوع اور احساسات و جذبات سے بھرپور ادب لکھتی ہیں۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

ہندوستانی ادیب اروند ادیگا بوکر ایوارڈ سے سرفراز

● لندن۔ 15 اکتوبر، 33 سالہ ہندوستانی ادیب اروند ادیگا کے اولین ناول ''دی وائٹ ٹائیگر'' کو برطانیہ کے پچاس ہزار پاؤنڈ کے گراں قدر مین بوکر انعام سے سرفراز کیا گیا ہے۔ 2008 کے لیے جن چھ ادیبوں کا بوکر انعام کے لیے انتخاب کیا گیا تھا، ان میں اروند دیگا اور آسٹریلیائی مصنف اسٹیو ٹولز پہلی مرتبہ اپنے ناولوں کے ساتھ سامنے آئے۔ ماضی میں اولین ناول کے ساتھ صرف دو ادیبوں نے یہ شرف حاصل کیا تھا، جن میں ڈی بی سی پیری کو 2003 میں ان کے ناول ''ویرنون گاڈ لٹل'' کے لیے اور ہندوستان کی ارندھتی رائے کو 1997 میں ان کی تخلیق ''دی گاڈ آف اسمال تھنگس'' کے لیے یہ انعام ملا تھا۔ اروند ادیگا کو بچپن سے ہی ناول نگاری کا شوق تھا۔ وہ چنئی میں پیدا ہوئے تھے اور سردست ممبئی میں رہائش پذیر ہیں۔ ''دی وائٹ ٹائیگر'' نامی اس ناول میں اروند نے دیہی زندگی سے صنعتی کامیابی کے ایک سفر کو پیش کیا ہے۔ نقد و نظر کی کسوٹی پر اس ناول کو ہندوستانی منظرنامہ پیش کرنے کی لطیف کوشش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اروند چوتھے ہندنژاد ادیب ہیں، جنھیں یہ باوقار انعام ملا ہے۔ اس سے قبل یہ انعام سلمان رشدی، ارندھتی رائے اور کرن ڈیسائی کے حصے میں آچکا ہے۔ اروند کا ناول نواں کامیاب ناول ہے، جس میں ہندوستان یا ہندوستانی شناخت سے تحریک حاصل کی گئی ہے۔ مین گروپ پی ایل سی کے

چیف ایگزیکٹیو پیٹر کلارک نے کل رات یہاں گلڈ ہال میں عشائیہ کی رنگارنگ تقریب میں ارونڈ کو 50ہزار پاؤنڈ کا انعامی چیک پیش کیا۔ ناولوں کے انتخاب کا مرحلہ آسان نہیں تھا کیوں کہ کئی مضبوط امیدوار موجود تھے لیکن ''دی وائٹ ٹائیگر'' نے فکر اور تفریح دونوں محاذوں پر یکساں طور پر ججوں کو متاثر کیا۔ یہ خیال جیوری کے سربراہ مائیکل پورٹیلو نے ظاہر کیا۔ 2008 کے ججوں کے پینل میں سابق ایم پی اور کابینی وزیر مائیکل پورٹیلو کے علاوہ ناول نگار لوئس ڈوفٹی، جیمس ڈیسٹیج اور ہردیپ سنگھ کوہلی شامل تھے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

متفرقات

● نئی دہلی۔ 9 ستمبر، سینٹ اسٹیفن کالج میں شعبۂ اردو کے زیراہتمام منعقد ایک پروگرام میں پروفیسر عبدالحق نے ''اقبال: شاعر و مفکر'' کے عنوان پر خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ دنیائے ادب میں علامہ اقبال وہ واحد شاعر ہیں جو فلسفے اور مسائل کو شاعری کے جذباتی انداز میں ایسے سمو دیتے ہیں کہ فلسفہ اور شعر ایک جان ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے موضوعات دنیا کے بیشتر موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر عبدالحق کا تعارف کراتے ہوئے کالج میں شعبۂ اردو فارسی کے صدر ڈاکٹر شمیم احمد نے بتایا کہ پروفیسر عبدالحق کی اقبال شناسی کا اعتراف پوری اردو دنیا نے کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ ماریشس اور پاکستان میں بھی اقبال کے موضوع پر کلیدی خطبے پیش کیے ہیں۔ اس موقعے پر بزم ادب کے اراکین طلبہ اور اساتذہ وغیرہ بھی موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● شولاپور۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام شولاپور میں یک بابی اردو ڈراما فیسٹیول کا انعقاد کیا گیا جس میں اقرا اکادمی شولاپور کا ڈراما ''فرنیش لگا'' (ہدایت کار صادق باغبان) اور گل موہر اکادمی کا ڈراما ''دفن بھومی'' (ہدایت کار اختر شیخ) پیش کیے گئے۔ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کی عکاسی کرنے والے دونوں ڈراموں کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا۔

بہترین اسکرپٹ رائٹر اور بہترین ہدایت کار کے لیے اختر شیخ (دفن بھومی)، بہترین اداکار کے لیے جنید چاندہ (دفن بھومی) اور بہترین اداکارہ کے لیے الفیہ شیخ (فرنیش لگا) کو چنا گیا۔ اردو اکادمی کے رکن جناب وقار احمد شیخ نے انعاموں کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ نومبر میں ریاستی سطح کے یک بابی ڈراما مقابلوں کا انعقاد کیا جائے گا۔

اس موقعے پر ڈراما نگار بی. ایس. کرنجگی ہدایت کار راجہ باغبان اور فنکار تنویر ملتان موجود تھے۔ (ڈاک سے)

● بریلی۔ 12 ستمبر، عالمی شہرت یافتہ شاعر وسیم بریلوی کو بریلی کے ایک ہندی روزنامہ کے اپنے انیسویں یوم تاسیس پر ''بریلی کا گورو ایوارڈ'' سے نوازا۔ بریلی کالج کے ہاکی کے میدان میں منعقد ایک کوی سمیلن میں یہ ایوارڈ دیا گیا۔ تقریب میں بریلی کی میئر سپریا، ایس پی کے رکن پارلیمنٹ دیرپال سنگھ یادو، آنولہ کے رکن پارلیمنٹ سروت سنگھ، ''دینک جاگرن'' کے جی ایم چندرکانت ترپاٹھی اور بریلی کے ایم پی سنتوش ناگر موجود تھے۔ (ڈاک سے)

● ناگپور۔ ودربھ مسلم فورم اور شاداب ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے اردو ادب اطفال کے نامور ادیب جناب وکیل نجیب کو ''ودربھ مسلم گورو پرسکار'' کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس سلسلے میں منعقدہ تقریب کی صدارت سنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ایس این پٹھان نے کی جبکہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہونے والی مقتدر ہستیاں ہیں: محترمہ پروین طلحہ (ممبر آف یونین پبلک سروس کمیشن، نئی دہلی)، محترمہ حسین دلوائی (نائب صدر مہاراشٹر اسٹیٹ کانگریس کمیٹی، ممبئی)، جناب اظہر حسین (سکریٹری WIFA، ممبئی)، جناب قیصر خالد (کمانڈنٹ ایس آر پی ایف گروپ IV، ناگپور)، جناب رنجیب دیشمکھ (سابق وزیر مہاراشٹر، ناگپور)، محترمہ زلفی شیخ (پرنسپل آر ایم پٹیل کالج، بھنڈارہ)، جناب راجو تماڈے (ایم ایل اے، مہاراشٹر)، جناب رامداس تڑس (سابق ایم ایل سی)، شری سلیل دیشمکھ (صدر کوشش فاؤنڈیشن)۔ جلسے میں جو شکشک سہکاری بینک، گاندھی ساگر، ناگپور کے ہال میں انعقاد پذیر ہوا تھا، جناب وکیل نجیب کے ادبی کاموں بالخصوص ادب اطفال کے تئیں ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور ان کی کتابوں کی ہندوستان گیر پیمانے پر پذیرائی پر اظہار مسرت کیا گیا۔ حکومت ہند کے ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے جناب وکیل نجیب کی پانچ کتابیں شائع کی جاچکی ہیں اور دہلی اردو اکادمی نئی دہلی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی جانب سے ایک ایک کتاب شائع ہوچکی ہے۔ شہر کے مختلف اداروں کی جانب سے اس ایوارڈ کے ملنے پر جناب وکیل نجیب کو مبارکباد دی گئی ہے۔ (ڈاک سے)

● لکھنؤ۔ ''آل انڈیا مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن لکھنؤ'' نے ممتاز شاعر و ادیب مرزا وسیم بیگ دل تاج محلی کو جوہر ایوارڈ و توصیف نامہ سے سرفراز فرمایا۔ اس موقعے پر ایک نیشنل سیمینار اور مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر ولی الحق انصاری نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب رحمت لکھنوی نے انجام دیے۔ جلسے میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر شارب ردولوی، جناب انیس انصاری (آئی اے ایس)، جناب رئیس انصاری، وسیم حیدر، اطہر نبی، ڈاکٹر رخسانہ لاری، ڈاکٹر اختیار جعفری، ڈاکٹر عباس رضا میر، رہبر جونپوری اور حضور نواب نے شرکت کی۔ آخر میں جناب

ایم وسی صدیقی بانی وسکریٹری نے اظہار تشکر کیا۔ (ڈاک سے)

●امروہہ۔ 22 ستمبر، معلم اردو بے روزگار یو امورچہ کی ایک اہم میٹنگ محلہ دربار کلاں میں شرافت علی کے مکان پر منعقد ہوئی جس کی صدارت خلیل احمد اور نظامت بشیر احمد نے کی۔ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے مورچہ کے نائب صدر فضل الرحمٰن خان نے کہا کہ پرائمری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تعیناتی کی جائے جس سے اردو پڑھنے والے مسلم سماج کے بچوں کو آسانی ہو۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرف تو ریاستی سرکار اردو کی ترقی کی بات کرتی ہے اور دوسری طرف معلم اردو اساتذہ کی تقرری نہیں کر رہی ہے۔ بار بار کیے جا رہے مظاہروں کے باوجود سرکار بے روزگاروں کے بارے میں نہیں سوچ رہی ہے جس سے ان کے سامنے فکر معاش بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر معلم اردو کی تقرری جلد از جلد نہیں کی جاتی تو سرکار کے خلاف تحریک کا بگل بجا دیا جائے گا۔ تاجدار احمد نے کہا کہ ریاستی سرکار اپنے وعدوں کو بھول گئی جس کے لیے ہمیں متحد ہوکر آواز اٹھانی ہوگی۔ اور سرکار کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنا ہوگا اگر جلد معلمین کی تقرری نہیں کی گئی تو آئندہ پارلیمانی انتخاب میں اس کا نتیجہ جھیلنا ہوگا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

مشاعرے

کل اسی موڑ پہ تھا کھیلتے بچوں کا ہجوم
پھول بکھرے تھے جہاں، راکھ بچھا دی کس نے
معراج فیض آبادی

●نئی دہلی۔ 15 اگست، یوم آزادی کے موقع پر اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ایوان غالب، نئی دہلی میں مشاعرہ جشن آزادی کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کی جبکہ نظامت منصور عثمانی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی کے وزیر ٹرانسپورٹ ہارون یوسف نے شرکت کی۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے افتتاحی کلمات ادا کیے جبکہ اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔ منتخب اشعار پیش ہیں:

اس قدر نقص پہ مبنی ہے چمن کی تنظیم
میں جو چاہوں تو اسے ڈھنگ پہ لا بھی نہ سکوں
گلزار دہلوی

صبح کو آئے، دن بھر ٹھہرے، شام کو واپس جانا ہے
اتنی دیر بسیرا جگ میں اتنی دیر ٹھکانا ہے
وقار مانوی

صحرا میں بیٹھے رہے کچھ بھی نہیں ہوا
مٹی کی طرح ریت بھی نم ہوکے رہ گئی
منور رانا

ستمگروں کا ہے فرمان گھر بھی جائے گا
اگر میں جھوٹ نہ بولا تو سر بھی جائے گا
منظر بھوپالی

وہ شاعری جو میر کو روٹی نہ دے سکی
دولت کما رہے ہیں اسی شاعری سے ہم
ڈاکٹر کلیم قیصر

کل اسی موڑ پہ تھا کھیلتے بچوں کا ہجوم
پھول بکھرے تھے جہاں راکھ بچھا دی کس نے
معراج فیض آبادی

سطح دریا پہ لکھے ہوں گے وفا کے قصے
ریت پر گھر کوئی خوابوں کا بنایا ہوگا
اختر شاہجہاں پوری

شہر در شہر اتنے ہوئے حادثے
رنگ چہروں کے اترے حنا لکھ گئی
ملکہ نسیم

ان لفظوں کو قید ہوئی جو مقصد تھے آزادی کا
جن لفظوں کو قید میں رہنا تھا وہ سب آزاد ہوئے
طاہر فراز

سدا سے ایک صدا آرہی ہے کانوں میں
عظیم کام ہے لوگوں کے دل میں گھر کرنا
زبیر ابن سیفی امروہوی

حدوں سے باہر گزرنے والو یہ خوش گمانی نہ مار ڈالے
دیے بجھا کر ہوا کے جھونکے سنا ہے سورج بجھا رہے ہیں
ڈاکٹر نسیم نکہت

چھپا کر پیاس ہونٹوں کی سمندر میں سدا رہنا
وہی سمجھیں گے جو آداب خودداری سمجھتے ہیں
ڈاکٹر مجاہد فراز

حالات کیسے دوستو اس گھر کے ہوگئے
شیشہ مزاج لوگ بھی پتھر کے ہوگئے
منصور عثمانی

ہر چند ہم نے دیکھا ہے اس شوخ کو بہت
کیسے مگر یہ کہہ دیں کہ ارماں نکل گیا

ابرارکرت پوری

اک روز گیا عرش بریں پر تو یہ دیکھا
کچھ بچیاں روتی تھیں وہاں باپ کے غم میں
اک دخترِ ناپید یہ کہتی تھی خدا سے
''ڈیڈی'' نے کیا قتل مراماں کے شکم میں

اسرار جامعی

لہروں کے ساتھ ساتھ بہت دور تک گئے
دریا سے گفتگو کی اجازت نہیں ملی

ملک زادہ جاوید

اخلاق و کردار کی کوئی شرط نہیں
جو جیتے گا وہ رہبر بن جائے گا

سلیم صدیقی

رات بھر کیا گھر میں اہلیہ نے ہنگامہ
عطر بیز خط نکلا کیا مرے سرہانے سے

بازغ بہاری

تمام عمر گناہوں کی زد میں رہتے ہیں
پھر اس کے بعد تلاشِ نجات ہوتی ہے

انور باری

ہم پہ حاوی جب ہوئی بیوی تو ہم نے کہہ دیا
ہم غلاموں کی طرح جیون بتا سکتے نہیں
قید زلفوں میں ہمیں کرنے سے پہلے سوچ لو
''اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں''

اقبال فردوی

آ مری موت مری جان بچا لے آکر
زندگی روز مجھے زیر و زبر کرتی ہے

عزم شاکری

ایک دو دن میں بھلا کون سمجھ سکتا ہے
اس زمانے کو سمجھنے میں زمانے لگ جائیں

راشد علی شفا

غیر پروں پر اُڑ سکتے ہیں حد سے حد دیواروں تک
امبر پر تو وہی اڑیں گے جن کے اپنے پر ہوں گے

خورشید حیدر

سبھی کی پیاس کو اعزاز یہ نہیں ملتا
سبھی کی ایڑی سے زم زم نہیں نکلتا ہے

شبینہ ادیب

یہ رنگ و نکہت کے استعارے یہ روشنی کی علامتیں سب
غزل کے لہجے میں ڈھل گئے تو چمک رہے ہیں دمک رہے ہیں

جاوید مشیری

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

وہ دل جس میں تمھارا غم نہ ہوگا
کسی اجڑے مکاں سے کم نہ ہوگا

مخمور سعیدی

● جے پور۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوشاں ادبی انجمن '' آبشار'' کی جانب سے 10 اکتوبر بروز جمعہ آفیسرس ٹریننگ اسکول جے پور میں آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مشاعرے میں سابق چیف جسٹس آف انڈیا جناب اے. ایم احمدی بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ جسٹس مکھ راج کلہ اور جسٹس ایس.بی. اگروال مہمانانِ امتیازی تھے۔ محترم المقام مخمور سعیدی کی صدارت میں منعقد اس مشاعرے کی نظامت کے فرائض محترم شین کاف نظام نے اپنے پرکشش انداز میں انجام دیے۔ '' آبشار'' کی جانب سے تمام مہمانوں اور شعرا کا استقبال کیا گیا اور فاروق انجینئر نے آبشار کا مختصر سا تعارف پیش کیا۔ مہمانِ خصوصی نے شمع روشن کی اور مشاعرے کا افتتاح کیا۔ '' آبشار'' کے صدر عادل رضا نے مشاعرے کا آغاز ان اشعار سے کیا:

عشق گلی میں جاتا کیا
جاتا تو پچھتاتا کیا
اس کے در پہ بیٹھ گیا
روز کا آنا جانا کیا

جودھپور کے نوجوان شاعر بریش اجر کا یہ شعر قابلِ تحسین رہا:

لوگ کہتے ہیں کہ ہیں سائے مگر
رات کے ٹکڑے شجر میں رہ گئے

دہلی کی نمائندگی کرتے ہوئے ناظم نقوی نے پڑھا:

تھوڑی خوشیاں پال کے رکھنا
غم کی کوئی تھاہ نہیں ہے

مدن موہن دانش کے اشعار ملاحظہ کریں:

درد سینے میں چھپائے رکھا
ہم نے ماحول بنائے رکھا

موت آئی تھی کئی دن پہلے
اس کو باتوں میں لگائے رکھا

لوکیش کمار ساحل نے دوہے پیش کیے:

چلے چلو موسم ہوئے کب کس کے انروپ
ایک مسافر کے لیے کیا چھایا کیا دھوپ
فاروق انجینئر

نہ اب جلوت نہ خلوت چاہتی ہے
نہ جانے کیا طبیعت چاہتی ہے
حسن کاظمی

گاؤں لوٹے شہر سے تو سادگی اچھی لگی
ہم کو مٹی کے دیے کی روشنی اچھی لگی
ارشد عبدالحمید

ہمیں تو شمع کے دونوں سرے جلانے ہیں
غزل بھی کہنی ہے شب کو بسر بھی کرنا ہے
اے ڈی راہی

آسماں سے زمیں پہ اترا تھا
آدمی کتنا صاف ستھرا تھا
ملکہ نسیم

ہو نہ یہ اس کے تغافل کا کہیں ردِعمل
جاگنے لگتی ہے کیوں میری انا شام ڈھلے
شین کاف نظام

اب کہاں چشم تر میں رہتے ہیں
خواب خوشبو کے گھر میں رہتے ہیں
عکس ہیں ان کے آسمانوں پر
چاند تارے تو گھر میں رہتے ہیں
مخمور سعیدی

وہ دل جس میں تمھارا غم نہ ہوگا
کسی اجڑے مکاں سے کم نہ ہوگا
اسے پا کر بھی دل بہلے نہ شاید
مگر وحشت کا یہ عالم نہ ہوگا

ان کے علاوہ ہندی کے مشہور شاعر اور دانشور جناب نند کشور آچاریہ نے نظمیں پیش کیں۔ مشاعرے کے اختتام پر فاروق انجینئر نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

کیسے بھولیں اس مہکتے پھول کو
جس کی خوشبو اب بھی عالمگیر ہے
تنویر سحری

● رامپور۔ 19 ستمبر، رامپور رضا لائبریری میں برصغیر کے مشہور شاعر مرحوم احمد فراز کی تعزیت کے سلسلے میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر کے نمائندہ شعرا نے شرکت کی۔ نشست کے آغاز میں لائبریری کے افسر کار خاص ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی نے کہا کہ احمد فراز کے انتقال سے ادب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ فراز صاحب کئی مرتبہ رامپور مشاعروں میں تشریف لائے۔ آخری بار رضا لائبریری کے مشاعرے میں آئے اس وقت کافی علیل تھے۔ وقار صاحب نے کہا کہ احمد فراز پاکستان کے سفیر بن کر ہندوستان آیا کرتے تھے۔ فراز صاحب نے فیض احمد فیض اور علامہ اقبال کے بیچ اپنا راستہ بنایا تھا۔ نشست کی صدارت ہندوستان کے مشہور شاعر جناب اظہر عنایتی نے فرمائی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب آر کے ماتھر موجود تھے۔ نشست کی نظامت استاد شاعر ہوش نعمانی نے کی۔ نشست کے منتخب اشعار پیش خدمت ہیں۔

اپنے انجام سے نہ ہو غافل
موت برحق ہے سب کو آنی ہے
عدنان ضیائی

کیسے بھولیں اس مہکتے پھول کو
جس کی خوشبو اب بھی عالمگیر ہے
تنویر سحری

تیرے لیے یہ عزت میرے لیے یہ شہرت
اس کے لیے فسانہ اس کے لیے حقیقت
نوید قیصر

احمد فراز مرگئے، کہنا غلط ہے یہ
دریا تھے علم و فن کا سمندر سے جا ملے
پرچم امروہوی

اسے بھی موت کی آندھی نے اب تو چھین لیا
بڑا سہارا تھا برگد کے جس شجر سے مجھے
غفران فریدی

جب مجھے یہ لگا گھر سے باہر مرا آب ودانہ ہوا
نام اس کا لیا اور لمبے سفر پہ روانہ ہوا
آذر نعمانی

اسے عبادت کا شوق سوجھا
چھڑا کے ذوق نماز میرا
شہزادہ گریز

جہان شعر میں عالی مقام تھا نہ رہا
زمانے بھر کو وفا کا پیام تھا نہ رہا
عتیق جیلانی ملک

اس کی سچائی اس کے ساتھ گئی
شہر میں کوئی دوسرا کب تھا
طاہر فراز

چاند کا قرب لگا کیسا چلو پوچھ آئیں
آسمانوں کے سفر سے وہ پلٹ آیا ہے
ڈاکٹر جاوید نسیمی

یوں مسکرائے قول پرانے بدل دیے
ہم نے غم حیات کے نقشے بدل دیے
عتیق آفریدی

تری نظر سے ملے گا کبھی تو جام خلوص
اسی امید پہ بیٹھے ہیں تشنہ کام خلوص
ڈاکٹر شریف قریشی

ٹھہر گیا ہے ترا عکس نوک مژگاں پر
جو بے خبر ہیں مری چشم تر کو دیکھتے ہیں
سعید رامش

وطن میں آپ جو امن و اماں کی بات کریں
تو میرے پرکھوں کے ہندوستاں کی بات کریں
ہوش نعمانی

اداس ہوگئیں شامیں چراغ ہوگئے جام
فراز اب تری آواز کا کہاں ہے مقام
ڈاکٹر وقار الحسن

ابھی عروس سخن کو تیری ضرورت تھی
ابھی بچھڑنے کا تیرے جواز تھا بھی نہیں
ندا نوگانوی

فرق فطرت کے تقاضے کا ہوا کرتا ہے
اپنے قد سے نہ بڑھا خود کو بڑھانے والا
اظہر عنایتی

خدا ہی آرزوؤں کے مطابق بخش دیتا ہے
تخلص تھا فراز ان کا رکھا اونچا مقام ان کا
طرب ضیائی

نشست میں آر کے ماتھر نے رضا لائبریری پر تاریخی نظم پڑھی۔ آخر میں ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی نے تمام معزز حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(صحافت، دہلی)

پتھروں کے درمیاں بہتی ندی اچھی لگی
جو حصار غم میں گزری زندگی، اچھی لگی
ڈاکٹر معظم علی خاں

● علی گڑھ۔ 15 اکتوبر، ابن سینا اکادمی اور علی گڑھ سوسائٹی کے مشترکہ تعاون سے ابن سینا اکادمی تجارہ ہاؤس، علی گڑھ کے وسیع ہال میں عید ملن کے عنوان سے مشاعرے کا انعقاد ابن سینا اکادمی کے سربراہ پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن کی صدارت میں کیا گیا جس میں علی گڑھ کے ممتاز استاد شاعر ڈاکٹر معظم علی خاں اور ہندی کے مزاح نگار ڈاکٹر گوپال بابو شرما کو شکھر شری سمان سے نوازا گیا۔ نظامت کے فرائض شکھر کے نائب صدر مشرف حسین محضر نے انجام دیے۔ مہمانان کا استقبال ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن خازن ابن سینا اکادمی نے کیا۔ مشاعرے کا آغاز ڈاکٹر جاوید احسن فلاحی نے ہدیۂ نعت سے کیا۔ چنیدہ اشعار باذوق قارئین کی نذر ہیں:

پتھروں کے درمیاں بہتی ندی اچھی لگی
جو حصار غم میں گزری زندگی، اچھی لگی
ڈاکٹر معظم علی خاں

تم مجھ سے محبت کی توقع نہ رکھو
تم تو میری نفرت کے بھی حقدار نہیں
جمنا پرشاد راہی

سوچنا یہ ہے کہ کیا ہم جی سکے اس کے بغیر
یوں تو کٹنے کے لیے یہ عمر ساری کٹ گئی
اویس جمال ہاشمی

محضر زباں زباں پہ محبت کے گیت ہوں
گزروں جدھر سے پیار کی بولی سنائی دے
مشرف حسین محضر

اپنی دھرتی سے بغاوت نہیں کرنے والے
بھول کر بھی یہ حماقت نہیں کرنے والے
ڈاکٹر جاوید احسن فلاحی

حق بیانی کا یہ صلہ ہے میاں
مجھ سے ہر شخص جو خفا ہے میاں
شاکر علی اشہر

مسکراتے چلو گنگناتے چلو
زندگی چار دن کی سجاتے چلو
پریم شرما پریم

مزاجوں میں وہ لے کے اک نرالی دھار نکلے ہے
ہتھیلی پر سجا کے سر سر بازار نکلے ہے
جانی فاسٹر

حوصلہ ان کا ہمیں اب آزمانا چاہیے
جن کی کوشش ہے الگ اک آشیانہ چاہیے
ہریش بیتاب

علاوہ ازیں قومی کوی رام گوپال وارشنے نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔ دیر رات تک چلے مشاعرے کے اختتام پر مشاعرہ کنوینر ہریش بیتاب نے بھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (صحافت، دہلی)

"کائنات علی باقر"

● لندن۔ ڈاکٹر علاء الدین خاں اور نسیمہ تراب الحسن کی اردو کے معروف افسانہ نگار علی باقر پر مرتبہ کتاب "کائنات علی باقر" کا اجرا گزشتہ ماہ لندن میں سوسائٹی آف فرینڈس انٹرنیشنل (صوفی) Society of friends International (SOFI) کے زیر اہتمام اردو کے مشہور شاعر اکبر حیدرآبادی اور شاعرہ زہرہ نگاہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اکبر حیدرآبادی نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر علاء الدین خاں کی یہ کوشش علی باقر فہمی میں ایک اضافہ ہے کیونکہ اس کتاب میں علی باقر کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی باقر ایک معروف افسانہ نگار اور سماجی کارکن تھے جنھوں نے اپنی کوششوں سے لاکھوں معذور افراد کے مسائل کو اپنی تحریروں، ٹیلی سیریل اور ڈاکومنٹری کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور علی باقر واحد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے معذوروں کے مسائل کو ہمدردی کے ساتھ اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے جس کی عمدہ مثالیں "آٹھ بیں"، "ادھورے رشتے"، "نیوٹما" اور "بہروپ" ہیں۔ محترمہ زہرہ نگاہ نے کہا کہ علی باقر کی کہانیاں دل کو چھو لیتی ہیں۔ زہرہ نگاہ اور اکبر حیدرآبادی کے علاوہ مصطفیٰ شہاب، جناب عدیل اور رضا علی عابدی نے بھی اظہار خیال کیا۔ سید توصیف پاشا نے علی باقر کا ایک مختصر افسانہ "بخار" پڑھ کر سنایا۔ (ڈاک سے)

"یہی سچ ہے"

● جموں۔ مشہور ادیب شری آنند لہر کی دسویں تصنیف اور چوتھے ناول "یہی سچ ہے" کی رسم اجرا جموں وکشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کی طرف سے کے.ایل. سہگل ہال میں ادا کی گئی۔ مشہور صحافی وید بھسین مہمان خصوصی تھے اور اکادمی کے سکریٹری جناب رفیق مسعودی مہمان ذی وقار۔ اس تقریب کی صدارت پدم شری جناب محمد یوسف ٹینگ نے کی۔ جناب وید بھسین نے کہا کہ آنند لہر کو صحیح معنوں میں اس دور کا نباض کہا جاسکتا ہے اور ان کی تخلیقات انسانیت کا پیغام دیتی ہیں۔ جناب رفیق مسعودی نے آنند لہر کو یہ ناول لکھنے پر مبارک باد دی۔ جناب محمد یوسف ٹینگ نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اس ناول کا موازنہ دیگر زبانوں میں لکھے گئے بہترین ناولوں سے کیا جاسکتا ہے اور اس ناول کے ذریعے لہر نے سماج کے مختلف پہلو ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ شری ٹینگ نے تقریباً ایک گھنٹے تک اس ناول کے مختلف پہلوؤں پر تقریر کی۔ اس موقعے پر ہر زبان کے ادیب، یونیورسٹی کے پروفیسر اور بھاری تعداد میں وکلا بھی موجود تھے۔ (ڈاک سے)

"آئینۂ سخن"

● اردو زبان میں جو شیرینی ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے جو کچھ مجھ سے ہوسکتا ہے وہ ضرور کروں گا۔" شری سشیل جی سابق ایم.ایل.سی. گلبرگہ نے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی جانب سے "آئینۂ سخن" (ڈاکٹر رزاق اثر شاہ آبادی) کی رسم اجرا کی تقریب میں بہ حیثیت مہمان خصوصی ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان مختلف زبانیں بولنے والوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا ملک ہے، یہاں ذات پات کی بنیاد پر امتیاز غیر ضروری ہے۔ اقلیتوں اور کمزور طبقات کی مدد اور ان کی فلاح و بہبود ہمارا فرض ہے۔

کنڑا ساہتیہ پریشد کے صدر شری ویر بھدرا نے اس تقریب کو بحیثیت مہمان خصوصی مخاطب کیا۔ انھوں نے اردو مادری زبان کے طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ کنڑا سیکھنے میں سبقت حاصل کریں کیوں کہ یہ سرکاری زبان ہے۔ جس طرح نظام کے دور میں کنڑا مادری زبان کے طلبہ اردو سیکھا کرتے تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ کنڑا ساہتیہ پریشد اور انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے اشتراک سے کنڑا کی مختلف تخلیقات اردو میں اور اردو کی منتخب تخلیقات کنڑا میں شائع کی جائیں۔

زبان و ادب چاہے کنڑا کا ہو یا اردو کا اس کے ابتدائی نقوش گلبرگہ ہی میں ملتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم تحقیق کے ذریعے یہاں کے ابتدائی لکھنے والوں کی تخلیقات کو منظر عام پر لائیں۔

اس موقعے پر حیدرآباد کے اہم شاعر ڈاکٹر رزاق اثر شاہ آبادی کے چوتھے شعری مجموعے ''آئینۂ سخن'' کی رسم اجرا جناب وہاب عندلیب نے انجام دی۔ انھوں نے کہا کہ رزاق اثر کا فن بتدریج ارتقا پذیر ہے۔ ''آئینۂ سخن'' میں شامل ان کا کلام کلاسکیت اور عصری شعور کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ رزاق اثر کے فن اور شخصیت پر پروفیسر عبدالحمید اکبر اور ڈاکٹر خالد سعید نے اظہار خیال کیا۔ جناب ولی (صدر انجمن) نے صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ جلسہ نہایت کم وقت میں منعقد کیا گیا اس کے باوجود سامعین نے بڑی تعداد میں شرکت کر کے اس کو کامیاب بنایا جس کے لیے وہ بے حد شکر گزار ہیں۔ انھوں نے کنڑا ساہتیہ پریشد کے صدر نشین کی تجویز کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ پریشد اور انجمن ایک دوسرے کے اشتراک سے اردو کنڑا میں ترجمہ کا کام انجام دیں۔

(ڈاک سے)

''ہم انھیں کہاں ڈھونڈیں''

● رانچی۔ 12 ستمبر، کل شام راج بھون میں رانچی سوسائٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ش اختر کی دو کتابوں ''ہم انھیں کہاں ڈھونڈیں'' اور ''ریسرچ کیسے کریں'' کا اجرا گورنر سید سبط رضی کے ہاتھوں سے ہوا۔ اس موقعے پر راج بھون میں ریاست جھارکھنڈ کی کئی نامور شخصیتیں موجود تھیں۔ ان میں جھارکھنڈ اسمبلی کے اسپیکر عالم گیر عالم ایم ایل اے گری ناتھ، رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انوار خان کانگریس کے کلفام مجیبی اور جے ایم ایم کے ڈاکٹر نصر فردوسی قابل ذکر ہیں۔ اس پروگرام کے بعد ڈاکٹر نصر فردوسی نے صحافیوں سے تفصیلی باتیں کیں۔ انھوں نے کہا کہ اقلیت اور خصوصاً مسلمانوں کو یقین رکھنا چاہیے کہ شیبو سورین کی قیادت میں نئی حکومت ان کے تمام مسئلوں پر کافی گہری نظر رکھ رہی ہے۔ یہ پوچھے جانے پر کہ کب تک مسلمانوں کے مسئلوں کا حل ہوگا۔ نصر فردوسی نے کہا کہ ابھی حکومت کی تشکیل ہوئی ہے ہمیں تھوڑا وقت ملنا چاہیے کہ ہم حالات کو سمجھ سکیں۔ (اخبار مشرق، دہلی)

وفیات

محمود درویش

● پچھلے دنوں مشہور و معروف فلسطینی شاعر محمود درویش کا امریکہ کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر ہوسٹن میں ان کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تھی جس کے بعد ان کی حالت بگڑ گئی تھی۔ وہ 67 سال کے تھے۔

محمود درویش کو فلسطین کا قومی شاعر سمجھا جاتا تھا۔ فلسطین کا قضیہ ان کی شاعری کا مستقل موضوع تھا۔ فلسطینی ریاست کا خواب جو فلسطینی برسوں سے دیکھ رہے ہیں اور جو ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا ہے، اس خواب کو زندہ رکھنے کے لیے محمود درویش ہمیشہ سرگرم رہے۔ فلسطینیوں کے جائز حقوق کو اسرائیل اور اس کی سرپرست عالمی طاقتیں جس طرح پامال کر رہی ہیں، اس کے خلاف محمود درویش کے دل میں زبردست جذبہ تھا جس کا اظہار ان کی شاعری میں کھل کر ہوا ہے۔

محمود درویش کی شاعری کے تراجم اردو سمیت دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ انھیں ان کی شاعری کے لیے کئی بین الاقوامی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ایک باضمیر انصاف پسند انسان اور انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف مضبوط اور موثر لہجے میں آواز بلند کرنے والے شاعر کی حیثیت سے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور ان کی یاد فلسطینیوں کی نئی نسلوں کو عزم اور حوصلہ دیتی رہے گی۔

خسرو متین

● نئی دہلی۔ 7 اکتوبر، معروف شاعر و ادیب خسرو متین کا گذشتہ شب اپنے آبائی وطن میرٹھ میں حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 56 برس کے تھے اور کم و بیش 30 سال سے دلی میں مقیم تھے۔ ان دنوں وہ گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول جوگا بائی، اوکھلا میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کی رحلت سے علمی و ادبی حلقوں میں رنج و غم کا ماحول ہے۔ انھیں میرٹھ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مرحوم خسرو متین نے بچوں کے ادیب کے طور پر اپنی شناخت قائم کی تھی۔ ان کی ڈیڑھ سو سے زائد کہانیاں اور نظمیں ہندو پاک کے مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کی کئی کہانیوں کا ہندی، انگریزی، گجراتی اور مراٹھی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ خسرو متین کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہیں۔

خسرو متین کی وفات پر اظہار تاسف کرتے ہوئے مختلف ادبا اور شعرا نے اسے ادب اطفال کے لیے خسارے سے تعبیر کیا ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ خسرو متین نہ صرف ایک اچھے افسانہ نگار اور شاعر تھے بلکہ ہر دلعزیز شخصیت کے مالک بھی تھے۔ اس زمانے میں جب بچوں کے لیے لکھنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں، خسرو متین نے پوری مستعدی کے ساتھ بچوں کے لیے سبق آموز کہانیاں اور نظمیں لکھیں۔ ڈاکٹر فاروق بخشی نے کہا کہ خسرو متین

کا انتقال ایک بڑا ادبی حادثہ ہے، خصوصاً ادب اطفال کے لیے۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے خسرو متین کی موت کو ذاتی صدمہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ ان کے ہم وطن بھی تھے اور پڑوسی بھی۔ انھوں نے کہا کہ ابھی ہم جلال انجم کے رخصت ہو جانے کے غم سے باہر بھی نہ آئے تھے کہ خسرو متین داغ مفارقت دے گئے۔ فاروق ارگلی، سراج نقوی، عظیم صدیقی، حقانی القاسمی، معین شاداب، یامین انصاری اور نعمان قیصر نے بھی خسرو متین کی وفات پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کے لیے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر و تحمل کی دعا کی۔

الحاج خلیل انجم

● ناگپور و کامٹی کی فعال اور سرگرم ادبی اور سماجی شخصیت الحاج خلیل انجم کا مورخہ 8 ستمبر 2008 پیر کو صبح چار بجے انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ انھیں 8 ستمبر کو ہی بعد نماز ظہر سپرد خاک کیا گیا۔ جنازے میں کثیر تعداد میں لوگ شریک تھے۔

الحاج خلیل انجم آرڈننس فیکٹری میں ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ 1996 میں سبکدوش ہونے کے بعد ان کی سماجی سرگرمیاں کافی بڑھ گئی تھیں۔ آرڈننس فیکٹری کی ملازمت کے دوران آپ نے غیر اردو داں حضرات کی اردو مشاعروں سے گہری دلچسپی کے پیش نظر ''بزمِ ادب'' قائم کی جس کے تحت انتہائی کامیاب اور یادگار آل انڈیا مشاعروں کا انعقاد کیا گیا۔ ادارۂ ادبِ اسلامی سے وابستگی کے باعث کامٹی میں کئی طرحی اور غیر طرحی نشستوں کا انعقاد بھی کیا۔ مشاعروں کی روداد لکھنے میں آپ کو خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ مرحوم ایک شریف النفس، سادہ مزاج، صوم و صلوٰۃ کے پابند اور وضعدار انسان تھے۔ 1998 میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر ''سفرنامہ'' لکھا اور اسے شائع بھی کروایا۔ آپ کی غزلیں، نظمیں اور ادبی و تنقیدی مضامین مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے پسماندگان میں تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ اہلیہ صغرا بی کا انتقال جنوری 2005 میں ہو گیا تھا۔

□□□

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Coucil for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Dept. of Higher Education, Govt. of India

West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110 066

Ph.: 26109746, 26169416 Fax: 26108159 E-mail: urducouncil@rediffmail.com

قومی کتاب میلہ بنگلور

تاریخ: 14 تا 23 نومبر 2008　وقت: 11 بجے دن سے شام 8 بجے تک

مقام: گائتری وہار، پیلیس گراؤنڈ، میکھری سرکل، رامنا مہارشی روڈ، بنگلور

قومی اردو کونسل کے اسٹال پر آپ کا خیر مقدم ہے، جہاں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں۔

مثلاً ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ثقافت، لسانیات، لغات، قواعد اور علم، کتب خانہ، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، مذہب، سماجیات، معاشیات، تجارت، سائنس و ٹکنولوجی، بچوں کا ادب (CBT in Urdu)، طب و معالجات۔

تبصرہ وتعارف

● **دیوانِ درد**

مرتبہ: ڈاکٹر نسیم احمد

صفحات: 336، قیمت:-/160 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: پروفیسر عبدالحق، مکان نمبر-2315، ہڈسن لائن، کنگس وے کیمپ، دہلی-110009

میں ڈاکٹر نسیم احمد کی بے مثال محنت کو آفریں کہتا ہوں جنھوں نے تدوین میں ان بزرگوں کی روایت زندہ کردی جو مشرقی ادب کی باز آفرینی اور متون کے تعین وترسیل میں عظمتوں کے حامل ہیں۔ تحقیقی کام میں سب سے زیادہ صبر آزما اور آزمائشی پہلو متن کا مطالعہ اور اس کی تصحیح وتسہیل ہے۔ خاص طور پر فارسی اور اردو کے قدیم مخطوطات کی قرأت اور صحت جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بڑے بڑے رہ روانِ شوق درماندگی سے دوچار ہوکر ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ موصوف نے ''دیوانِ درد'' کی جمع وترتیب میں جس علمی استقامت کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی تحقیقی بصیرت کی روشن مثال ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ انھوں نے اردو اساتذہ پر عائد فرض ادا کیا ہے جس کی عدم ادائی میں دانش گاہوں کے اساتذہ ہدفِ تنقید بنتے رہے ہیں۔

شعری تفہیم وتنقید کے ساتھ فن کار کی فکروآگہی کے مطالعے کے لیے متون سے صرفِ نظر گمرہی کا موجب بنتا ہے۔ ہمارے اعتقادی سرمائے میں اس کی بڑی مکروہ صورتیں ملتی ہیں۔ فلک شگاف ادعائیت کے باوجود صحیح متون سے محرومی ادب کا سب سے الم ناک حادثہ ہے۔ عہدِ میرومرزا کو عہدِ زریں کہہ کر مطمئن ہوجانا بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ اس دور کے فن کار ثلاثہ کا سرمایۂ کلام کسی مردِ خودآگاہ کی تلاش میں تھا۔ جو اس وراثت کو استناد دے سکے۔ ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوانِ درد'' اور ''غزلیاتِ سودا'' کو مرتب کرکے اس عہدِ زریں کے ایک بڑے حصۂ کلام کو اعتبار بخشا ہے۔ غزلیاتِ سودا، اور متعلقاتِ سودا، کی اشاعت نے بلند نگہی کی جو مثال قائم کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔

ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوانِ درد'' کی تدوین میں عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ صرف کیا ہے۔ اردو کے اول اور اکیلے صوفی اور ذی علم وفکر شاعر کے ممکن حد تک مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کو جمع کرکے ایک مستند متن پیش کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ دیوان کے جامع مقدمے میں فاضل مرتب نے ان تمام نسخوں کے متون کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک معتبر نسخے کی تیاری کی پوری داستان قلم بند کردی ہے جو اصولِ تدوین کے اعلیٰ معیار کی دلیل ہے۔ تمام مصادر کا احاطہ اور ان کے استقام کا تجزیہ بھی بڑی دیدہ وری کے ساتھ کیا گیا ہے اور تقریباً سبھی مسائل زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ خود مرتبین کی غلطیاں بھی مطبوعہ دواوین میں راہ پا گئی ہیں جن سے صورتِ حال اور بھی خراب ہوگئی ہے۔ جیسے درد کے ضمن حیات کے نو دریافت نسخے میں ہوا ہے یا تدوین کے معروف شناور رشید حسن خاں کے مرتب کردہ ''دیوانِ درد'' میں سیکڑوں غلطیاں شاملِ متن ہوگئی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان وبیان کے عصری اسالیب، تاریخ، تمدن، شعریات اور قدیم تحریروں کی صحیح قرأت پر قدرت نہ ہوتو یہ کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر نسیم احمد نے کمالِ احتیاط کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اردو کونسل ان کی بیش بہا صلاحیتوں سے مزید استفادے کی صورت پیدا کرے کہ وہ اس دور کی تخلیقات کے رمز شناس ہیں۔

● **مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ**

مصنف: محمد حسن

صفحات: 404، قیمت:-/28 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: نوشاد عالم، 268 سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-110067

پروفیسر محمد حسن کی شخصیت اردو والوں کے لیے محتاجِ تعارف نہیں۔ ''مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ'' ان کی ایک اہم تنقیدی کاوش ہے۔ یہ کتاب سات حصوں اور اکیس ابواب میں منقسم ہے۔ دیباچے میں مصنف نے کتاب میں مذکور تین مرکزی تصورات کا ذکر کیا ہے۔

1. ادب اور حقیقت کا تعلق، 2. ادب کے پرکھنے کا طریق کار اور
3. ادب کی سماج پر اثر اندازی کی نوعیت یا افادیت

پوری کتاب انھی تین مرکزی تصورات کی تشریح وتعبیر ہے اور تینوں تصورات کی مختلف جہات اور ابعاد کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ تصنیف کی غرض وغایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ محمد حسن تحریر کرتے ہیں:

''زیرِ نظر تصنیف کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ ادب کی ماہیت، شناخت اور اس کے مجلسی رشتوں کے بارے میں مشرق ومغرب کی تنقیدی کاوشوں کے درمیان مختلف مماثلتوں اور اختلافات کی نشاندہی کی جائے اور اس جائزے کی

مدد سے ادب اور خارج کے تعلق، ادبی معیار و اقدار اور ادیب کے سماجی رشتوں اور اس کی معنویت کے بارے میں مشرق و مغرب کی مدد سے کوئی عام خاکہ تیار کیا جائے۔''

مصنف نے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور اس پر محض تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ حوالوں سے بھی کارآمد بحث کی ہے جو ادب کے مجموعی کردار کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔

حصہ اول میں چار ابواب ہیں اور ہر باب میں ایک نئی بحث ہے۔ پہلا باب تنقیدی ادراک کی ابتدا پر ہے جس میں مصنف نے تخلیق پر تنقیدی شعور کو مقدم ٹھہراتے ہوئے مثالوں سے اپنی بات صراحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ دوسرے باب میں افلاطون کے تنقیدی نظریے کا بیان ہے۔

اس باب میں مصنف نے افلاطون کے تصور کائنات، نقل اور حسن و عشق کی ماہیت پر بھرپور نگاہ کی ہے۔ تیسرا باب ارسطو کی بوطیقا پر ہے۔ ارسطو کے سائنٹفک ذہن کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ یہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فن کے حوالے سے ارسطو اپنی بحث صرف شاعری تک محدود کردیتا ہے اور شاعری میں بھی صرف المیہ کو اپنا موضوع خاص ٹھہراتا ہے۔ چوتھے باب میں روم میں تنقیدی نظریات کا بیان ہے۔ روم کے کچھ اہم نظریہ

سازوں مثلاً سسرو، کوئن ٹی لین اور ہوریس کا بھی ذکر ہے۔ اس کے باوجود کہ ان نظریہ سازوں نے افلاطون اور ارسطو کے نظریات پر کوئی اضافہ نہیں کیا یا فصاحت و بلاغت کے سلسلے میں ان کے وضع کردہ اصول اہم ہیں، جن سے تاثیر اور بیان میں فرق پیدا ہوا ہے۔

حصہ دوم پانچویں اور چھٹے ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے پانچویں میں چینی ادب کے مجموعی کردار کی شناخت کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ابتدائی دور کے چینی فن پاروں سے مدد لی گئی ہے۔ چھٹے باب میں جاپانی شاعری کے نمونے پیش کرنے کے ساتھ اس کے کلیدی تصور کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی اور پیہم تغیر پذیری کے سبب چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو برتنے کے حوالے سے جاپانی ادب کے مجموعی کردار کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے ساتھ جاپانی ادب پر بدھ مت کے اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

حصہ سوم میں ساتواں باب ہندوستانی شعریات پر ہے۔ سنسکرت تنقید کی ابتداء، دھونی النکار اور رس کے نظریات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ دکھایا گیا ہے کہ جس طرح یونان کے بعض حکمانے انسان کے جملہ حواس کو پانچ خانوں میں تقسیم کیا تھا اسی طرح انسان کے پورے جمالیاتی نظام کو سنسکرت جمالیات نے نورس کی شکل میں تقسیم کیا ہے۔

حصہ چہارم میں دو باب ہیں۔ آٹھواں باب عرب کے تنقیدی نظریات اور نواں باب ایران کے تنقیدی نظریات پر ہے۔ عرب کے تنقیدی نظریات کے تحت عربی ادب میں مواد اور ہیئت اور ہیئت کو اہمیت حاصل ہونے کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ شیخ بوعلی سینا، ابن رشد اور ابن خلدون کی خدمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس سے عربی ادب کی مختلف جہتیں روشن ہوتی ہیں۔ ابن عربی کے افکار نے معنی اور صورت میں دونوں لحاظ سے عربی ادب کو جو وسعت دی ہے اس کا تذکرہ بہت عمدگی سے کیا گیا ہے۔

نویں باب میں ایران کے تنقیدی نظریات کے تحت ایرانی ادب کو قدیم و جدید میں تقسیم کرکے پیش کیا ہے۔ تصوف کے اثرات کی نشاندہی بھرپور انداز میں ملتی ہے۔

حصہ پنجم، دسویں باب میں مغربی یوروپ میں تنقیدی نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے تحت ارسطو اور افلاطون کے نظریات کی اندھی تقلید سے آزاد کرانے کی ڈرائیڈن کی کوششوں کا ذکر بڑے دلنشیں انداز میں کیا گیا ہے۔

گیارھویں باب میں تخیل کی مختلف تعریفوں کا بیان ہے۔ بارھویں اور تیرھویں باب میں سیاسی و سماجی اور اقتصادی و تہذیبی سطح پر جو زبردست تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں ان کے اثرات زندگی، ادب اور تاریخ و تہذیب پر کس نوعیت کے پڑ رہے تھے، یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیرھویں باب میں مختلف فن پاروں اور ادبی شہ پاروں کو جانچنے اور پرکھنے کے طریق کار پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

حصہ ششم میں چودھواں، پندرھواں اور سولھواں باب ہے جو بالترتیب روس، امریکا، نئی تنقید اور تشکیلیت اور ساختیت'' کے عنوانات پر ہے۔ روس کے بیان میں وہاں کے دو دبستانوں کا تفصیلی ذکر ہے اور ان سے متعلق فنکاروں کی تخلیقات اور ان کے نظریات پر بحث کی گئی ہے۔ امریکا میں نئی تنقید کے تحت اس کی ابتدا اس کے پس منظر کا بیان بہت وضاحت سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شکاگو اسکول کے اختلافات کو بھی کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے تاکہ نئی تنقید کے حوالے سے پوری تصویر سامنے آجائے۔ تشکیلیت اور ساختیت کے تحت اس کی مختلف جہات کو بہت سہل بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

سترہ سے اکیس تک ابواب حصہ ہفتم میں شامل ہیں۔ اس میں ہیئتی تنقید، مارکسی تنقید، ادبی سماجیات تقابلی تنقید اور اختتامیہ کے عنوانات سے شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ مختلف دبستانوں کی باریکیوں کا بڑی خوبی سے احاطہ کیا گیا ہے۔

''مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ'' اردو تنقید کے ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ بالخصوص تنقید کے شعبے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ قیمت نہایت مناسب اور گیٹ اپ بھی بہتر ہے۔

● آجکل اور پریم چند

مرتب: ڈاکٹر ابرار رحمانی

صفحات: 238، قیمت:-/210 روپے

ناشر: ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند
سوچنا بھون، سی۔جی۔او کمپلیکس، نئی دہلی-110003

مبصر: ڈاکٹر پردیپ جین، B-46، نئی منڈی، مظفر نگر-251001

پریم چند وہ زندۂ جاوید مصنف ہے جو اپنی تخلیقات کے ذریعے ظلم وجبر، ناانصافی، استحصال، فرقہ واریت وغیرہ تمام سماجی برائیوں سے مسلسل جنگ کرتا رہا اور سامراجی نظام کے خلاف اعلان جنگ کرنے والا قلم ہاتھ میں لیے برطانوی سامراج کو بھی للکارتا رہا۔

پریم چند نے اردو سے ہندی میں ہجرت کی تھی جس کی نسبت اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ انھوں نے معاشی مشکلات سے نجات پانے کی غرض سے ایسا کیا اور اس بات کو خود پریم چند اپنے خطوط کے ذریعے ہوا دیتے نظر آتے ہیں۔ مگر حقیقت صرف اتنی ہی نہیں۔ قابل غور ہے کہ اسکولی نصاب میں منظور شدہ کتابوں کے علاوہ پریم چند کی کسی اردو کتاب کا دوسرا ایڈیشن ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو اس وقت جب انھیں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگانا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اردو حلقے کی قوت خرید کم ہونے کی وجہ سے بھی پریم چند کو ہندی کی جانب راغب ہونا پڑا ہوگا۔ چند ماہ قبل مشہور افسانہ نویس جناب مشرف عالم ذوقی نے اپنے ایک مضمون میں اس طرف اشارہ کیا تھا۔ کیا اچھا ہو کہ ذوقی صاحب اور دیگر ادبا تفصیل میں جا کر ان تمام وجوہات کا خلاصہ کریں کہ اردو سے ہندی میں ہجرت کیوں ہوئی اور ہوتی رہتی ہے۔ بہرکیف پریم چند ادبیات پر جتنا تحقیقی کام ہندی میں انجام دیا جا چکا ہے اردو میں غالباً اس کا دس فیصدی بھی نہیں ہو پایا۔ جبکہ ہندی کے پاس ماہر پریم چند کے نام پر تا حال صرف ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا ہیں، دوسری جانب اردو کے پاس مدن گوپال، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر جعفر رضا اور گوپال کرشن مانک ٹالا جیسے ماہرین پریم چند موجود ہیں۔

اردو ادب کو فروغ دینے میں پبلیکیشن ڈویژن کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہ نامہ ''آجکل'' کی خدمات اردو دنیا سے پوشیدہ نہیں۔ اس رسالے میں پریم چند معتبر ناقدین کے مضامین متواتر شائع ہوتے رہے ہیں۔ پریم چند کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کے موقعے پر ''آجکل'' نے اگست 1980 کا شمارہ پریم چند کے نام وقف کیا تھا۔ پریم چند کے 125 ویں یوم پیدائش کی تقریبات کے موقع کو بھی اس رسالے نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ رسائل میں شائع شدہ مضامین کی نسبت طلبہ اور محققین کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ رسالے کے متعلقہ شمارے نایاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نیز بعض اوقات یہ علم بھی نہیں ہونے پاتا کہ کس خاص موضوع پر کون کون سے مضامین کب کب شائع ہوئے ہیں۔ پریم چند کے حوالے سے اس کمی کو پُر کرنے کی جانب ''آجکل'' کے ادارے نے توجہ کی اور نتیجتاً ڈاکٹر ابرار رحمانی کا مرتب کردہ زیر نظر مجموعہ ''آجکل اور پریم چند'' منظر عام پر آیا جو ''آجکل'' میں شائع شدہ 20 مضامین پر مشتمل ہے۔

''احوال واقعی'' کے عنوان کے تحت مرتب نے پریم چند کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ پریم چند سے پہلے کی افسانوی تخلیقات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ پریم چند کی اہمیت واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''پریم چند اردو فکشن کا ایک لیجنڈ ہے جس نے اپنی کہانیوں اور افسانوں سے اردو فکشن میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ایسا اضافہ جو ناقابل فراموش ہے... جس کے ذکر کے بغیر اردو فکشن کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی... جو اردو فکشن کی تاریخ کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی۔'' (صفحہ 2)

پریم چند ادبیات پر تحقیق کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ زیر نظر مجموعے کے مشتملات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر رحمانی خود کو تحقیقی اغلاط سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مثلاً مجموعے میں شامل ایک مضمون کی نسبت موصوف رقم طراز ہیں:

''مجموعے کا پہلا مضمون خود پریم چند کی آپ بیتی ہے۔ منشی پریم چند کی لکھی ہوئی یہ آپ بیتی ہندی میں شائع ہو چکی تھی لیکن اردو داں طبقے کے سامنے پہلی دفعہ ''آجکل'' اردو میں اکتوبر 1944 میں پیش کی گئی۔'' (صفحہ 4)

''جیون سار'' کے عنوان سے پریم چند کی یہ آپ بیتی ان کے اپنے ہندی ماہ نامہ ''ہنس'' کے جنوری/فروری 1932 کے مشترکہ شمارے ''آتم کتھا نمبر'' میں شائع ہوئی تھی۔ منشی دیا نرائن نگم نے اسے اردو میں منتقل کرکے ''منشی پریم چند کی کہانی، ان کی زبانی'' کے عنوان کے تحت ''زمانہ'' پریم چند نمبر میں شائع کر دیا تھا جو دسمبر 1937 میں چھپا تھا۔

پریم چند ادبیات کے حلقے میں ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ زیر نظر مجموعے میں ''پریم چند کی ڈائری کا مطالعہ'' عنوان کے تحت ان کا ایک مضمون ہندی سے منتقل ہو کر شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے پریم چند کی ذاتی ڈائری کے حوالے سے چند ایسے حقائق بیان کیے ہیں جن سے ادبی دنیا عام طور پر ناواقف ہے۔ لیکن پریم چند کی ڈائری کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر گوئنکا یہ نہیں بتاتے کہ خود پریم چند کے ہاتھ کی لکھی ڈائریاں کہاں محفوظ ہیں۔ ادبی دنیا اس حقیقت سے نابلد نہیں ہے کہ اتفاقاً محفوظ رہے پریم چند کے مخطوطات ان کی بیوہ محترمہ شورانی دیوی لے بنارس میں مقیم جناب مراری لال کیڈیا کے حوالے کر دیے تھے جنھیں انھوں نے رام رتن پستک بھون میں ایک طویل عرصے تک محفوظ رکھا اور ادبی دنیا اس حقیقت سے بھی ناواقف نہیں ہے

کہ پریم چند کے وہ تمام مخطوطات کس طرح عاریۃً مانگے جا کر گوئنکا صاحب کے اس ذاتی ذخیرے میں پہنچ گئے ہیں جس تک کسی محقق یا ادیب کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے سے حاصل کردہ تمام اصل ماخذ بھی ان کی رحلت کے بعد گوئنکا صاحب کے ہی پاس رہ گئے ہیں۔ گوئنکا صاحب پریم چند کے مخطوطات کی اہمیت اپنے مضامین میں واضح کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا امید رکھنی چاہیے کہ وہ پریم چند کے تمام ادبی سرمائے کو محققین تک پہنچانے کی غرض سے کسی نہ کسی آرکائز میں محفوظ کرادیں گے تاکہ ''پریم چند کی ڈائری کا مطالعہ'' جیسے دیگر اہم اور یادگار مضامین سے ادبی دنیا بہرہ ور ہوسکے۔

مدن گوپال صاحب نے ''کلیاتِ پریم چند'' مرتب کر کے وہ کام انجام دیا ہے جس کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی۔ پریم چند کے اولین سوانح نگار ہونے کا شرف رکھنے والے مدن گوپال صاحب کی تحریروں کا پریم چند ادبیات سے دلچسپی رکھنے والوں میں عام طور پر نوٹس لیا جاتا رہا ہے اور آئندہ بھی لیا جاتا رہے گا اور یہی وجہ ہے کہ زیرِ نگاہ مجموعے کے قابل مرتب نے مدن گوپال صاحب کے مضمون ''تصانیفِ پریم چند: تلاش و تحقیق'' کا بطور خاص نوٹس لیا ہے۔ مجموعے میں شامل 20 مضامین میں سے یہ واحد مضمون ہے جس پر رحمانی صاحب نے 15 فٹ نوٹس لگائے ہیں جن میں مضمون میں راہ پا جانے والی غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ گوکہ بعض غلطیاں رحمانی صاحب کی نگاہ سے بھی بچ گئی ہیں۔ تاہم ایک ہی مضمون میں 15 تحقیقی غلطیاں وارد ہونا مدن گوپال صاحب کی تحقیقی صلاحیتوں پر ایک بڑا سوالیہ نشان قائم کرتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ جب موصوف کے ایک ہی مضمون میں اتنی تحقیقی خامیاں موجود ہیں تو ان کی مرتب کردہ ''کلیاتِ پریم چند'' کی 24 ضخیم جلدوں کی کیا حالت ہوگی۔

پروفیسر قمر رئیس نے اپنے مضمون میں پریم چند ادبیات میں ہوئے کام کا بھرپور جائزہ لیا ہے ان کا مضمون پریم چند ادبیات کے محققین کو چند ضروری اطلاعات فراہم کرانے کی کامیاب کوشش کے طور پر سامنے آتا ہے۔

یوں تو مجموعے میں پروفیسر احتشام حسین، اصغر علی انجینئر، زبیر رضوی، عظیم الشان صدیقی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم جیسے ادبا کے مضامین شامل ہیں۔ مگر تمام مضامین پر ایک مختصر سے تبصرے میں مفصل بحث نہیں کی جاسکتی۔ لیکن دو مضامین اور بھی اس نوعیت کے ہیں جن پر بات کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے وقت پروفیسر مسعود حسین خاں نے 71-1970 میں بحث چھیڑی تھی کہ اردو ''گئودان'' تصنیف نہیں بلکہ ترجمہ ہے۔ بحث طویل ہوئی اور دیگر محققین نے اس موضوع پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ زیرِ نظر مجموعے میں بھی اسی موضوع پر محمد یونس کا مضمون ''گئودان تصنیف ہے یا ترجمہ'' شامل ہے۔ گوکہ یونس صاحب اپنے مضمون میں پروفیسر مسعود حسین کے دلائل سے کسی قدر متفق نظر آتے ہیں مگر ''گئودان'' جیسے ناول کے اردو دنیا کے ہاتھوں سے نکل جانے کے خدشے کی بنا پر وہ ''گئودان'' کو ترجمہ قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ تحقیق میں ذاتی احساسات، جذبات اور زاویہ نظر کی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں یہ چیزیں راہ پاجائیں، اسے تحقیق نہیں کہا جاسکتا۔ پریم پال اشک کا مضمون ''فلموں میں پریم چند'' پریم چند ادبیات کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش ہے جسے محققین و ناقدین نے معرضِ التوا میں ڈال رکھا ہے۔ ممبئی کی مایہ نگری میں گزرا پریم چند کا تقریباً ایک سال مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ اشک صاحب کا یہ مضمون محققین کو اس جانب رجوع کرنے میں کامیاب ہوسکے گا۔

زیرِ نظر مجموعے کے فاضل مرتب نے پریم چند ادبیات کے تقریباً تمام پہلوؤں پر مضامین فراہم کرکے ایک قابلِ قدر اور یادگار مجموعہ ترتیب دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر اس مجموعے کی ضخامت کچھ اور بڑھا کر اس میں خواتین اور اطفال کی نسبت پریم چند کے زاویۂ نگاہ کو واضح کرنے والے مضامین بھی شامل کرلیے جاتے تو بہتر ہوتا۔ نیز پریم چند ادبیات پر تحقیق کے میدان میں اہمیت رکھنے والے ڈاکٹر جعفر رضا اور گوپال کرشن مانک ٹالا کے مضامین شاملِ اشاعت نہ ہونا کھٹکتا ہے۔ ممکن ہے ان حضرات کے مضامین ''آجکل'' میں کبھی شائع نہ ہوئے ہوں۔

اپنے مشمولات کی وجہ سے زیرِ نظر مجموعہ پریم چند ادبیات میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کا حامل ہے۔

● مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

مصنف: خلیق انجم

صفحات: 290، قیمت: 230 روپے

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002

مبصر: مخمور سعیدی، J-3/141C کرشنا کنج ایکسٹنشن، لکشمی نگر، دہلی-92

یہ کتاب خلیق انجم کے ان خاکہ نما مضامین یا مضمون نما خاکوں کا مجموعہ ہے جن میں انھوں نے اپنے ان بزرگوں اور ہم عمروں کی ذات و خدمات کو موضوع بنایا ہے جو (سید حامد صاحب اور ڈاکٹر جمیل جالبی کو چھوڑ کر، خدا انھیں سلامت رکھے) اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور جن سے ان کی ذاتی واقفیت رہی ہے۔ ان میں شاہد احمد دہلوی، امتیاز علی خاں عرشی، رشید احمد صدیقی سے لے کر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انور صابری اور بیگم حمیدہ سلطان تک شامل ہیں۔ دلی کے بزرگوں میں خلیق انجم بسمل سعیدی مرحوم سے بھی قریب رہے ہیں بلکہ بعض دوسروں کی بہ نسبت ان کے ساتھ ان کی کچھ زیادہ ہی قربت رہی ہے مگر ان کا خاکہ کتاب میں نہیں ہے، ذکر کی جگہ ہے۔

کل 19 شخصیتیں ہیں جن کے شخصی اوصاف اور علمی اور ادبی اکتسابات کا ذکر خلیق انجم نے دل کو چھو لینے والے انداز میں کیا ہے۔ میں نے ان خوبصورت نثری تحریروں کو خاکہ نما مضامین یا مضمون نما خاکے اس لیے کہا کہ ان میں ''شخصیت'' کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اس کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ خلیق انجم کا طریق کار یہ ہے کہ وہ شخصیت کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ ہی اس کے ان کاموں کا بھی ذکر کرتے جاتے ہیں جو اس نے کسی مخصوص شعبے میں انجام دیے ہیں۔ ان کا یہ طرز نگارش بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے ان مضامین کی یاد دلاتا ہے جو ان کی کتاب ''چند ہم عصر'' میں شامل ہیں۔

استاد رسا دہلوی کا جو خاکہ کتاب میں شامل ہے، وہ اب سے شاید چالیس سال پہلے استاد رسا کی زندگی میں ماہنامہ ''ساقی'' کراچی میں شائع ہوا تھا۔ شاہد احمد دہلوی کا یہ رسالہ تقسیم ملک سے پہلے دہلی سے نکلتا تھا اور اردو کے معتبر اور موقر ادبی ماہناموں میں اس کا شمار تھا۔ تقسیم کے بعد شاہد احمد دہلوی وطن مالوف کی سکونت ترک کرکے کراچی میں جا بسے تو اس رسالے کی شہریت بھی بدل گئی لیکن اس کا ادبی اعتبار اور وقار کم وبیش برقرار رہا۔ استاد رسا کا خاکہ بہت پسند کیا گیا۔ اس سے پہلے خلیق انجم صاحب کا لکھا ہوا ایک اور خاکہ ''امریکہ صاحب'' میری نظر سے گزرا تھا۔ یہ خاکہ انھوں نے اپنے علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں لکھا تھا اور اس میں اپنے کسی ساتھی طالب علم کے کردار کی عکاسی کی گئی تھی جو اول درجے کا متفنی بھی تھا اور دوسروں پر دھونس جمانے کا عادی بھی۔ اس خاکے میں طنز اور تمسخر کے عناصر اس خوبی سے یکجا ہوئے تھے کہ پڑھنے والا داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ افسوس کہ وہ اس کتاب میں شامل نہیں ہے۔

پچھلے تیس پینتیس سال میں خلیق انجم کی کئی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ وہ یا تو تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی ہیں یا ترتیب و تدوین کے کام سے ان کی دلچسپی کی دین۔ یہ دونوں کام ایسے ہیں جو ان کی منصبی ذمے داریوں سے بھی تھوڑی بہت مناسبت رکھتے ہیں لہٰذا ان پر ان کا زیادہ توجہ صرف کرنا قابل فہم ہے لیکن جہاں تک اسلوب کی شگفتگی، بیان کی تازگی اور اظہار کی برجستگی کا تعلق ہے، اس کا خصوصی مظاہرہ ان کے انھی خاکوں میں ہوا ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

جن 19 لوگوں کے یہ خاکے ہیں، ان میں بیشتر وہ ہیں جن سے خلیق انجم صاحب کا قریبی رابطہ رہا ہے لیکن کچھ وہ بھی ہیں جن سے گنتی کی ملاقاتیں رہی ہیں۔ جو لوگ ان کے قریبی رابطے میں رہے ہیں ان کے خاکے بہت جاندار اور بھرپور ہیں کیونکہ ان میں جو کچھ ہے وہ محض شنیدہ نہیں دیدہ بھی ہے۔ زیادہ تر خاکے اسی ذیل میں آتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن میں دیکھے ہوئے کا کم، سنے ہوئے کا بیان زیادہ ہے۔ مثلاً شاہد احمد دہلوی کا خاکہ جس میں مرحوم سے خلیق انجم صاحب کی کچھ ملاقاتوں اور ان کی ادبی کارگزاریوں کا ذکر تو ہے، ان کا خاندانی پس منظر بھی سامنے آتا ہے لیکن ان کی شخصیت کا بھرپور نقش نہیں ابھرتا۔ کچھ صفحات تو شاہد صاحب کے نام راجہ مہدی علی خاں کے خطوط ہی کی نذر ہوگئے ہیں۔ ان خطوط سے شاہد احمد دہلوی کے کردار کا ایک پہلو ضرور سامنے آتا ہے کہ وہ ضرورت مند ادیبوں اور شاعروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ مولانا عبدالسلام نیازی، مولانا انور صابری، رشید احمد صدیقی، علی جواد زیدی، سید حامد اور نورالحسن ہاشمی وغیرہ کے جو خاکے ہیں، ان سے ان کی شخصیتیں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہیں اور پڑھنے والے سے اپنا مکمل تعارف کرادیتی ہیں۔

دلی پچھلی صدی کے نصف آخر میں بہت کچھ بدل گئی تھی، نئی صدی میں اور بھی تیزی سے بدل رہی ہے۔ اس کا جغرافیائی نقشہ پھیلتا جارہا ہے مگر وہ تہذیبی اور تمدنی ماحول جو دلی کی پہچان تھا اور وہ معاشرتی اور ثقافتی خصلتیں جو دلی والوں کی شناخت قائم کرتی تھیں سمٹ سکڑ کر بتدریج معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ دلی کی فراخ دلی مشہور ہے، اس نے باہر سے آنے والوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے لیکن اب سے پہلے جو لوگ یہاں آتے رہے انھوں نے یہاں کے شعار بھی اپنا لیے۔ اب باہر سے آکر یہاں بسنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس نے ایک یلغار کی صورت اختیار کرلی ہے اور اس یلغار نے دلی کا شہری جغرافیہ ہی نہیں بدلا، اس اقداری نظام کو بھی تہہ و بالا کردیا ہے جسے دہلویت کا نام دیا جاتا تھا۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ان شخصیتوں کے علاوہ جن کا اس میں ذکر ہے، بالواسطہ طور پر اس دلی مرحوم سے بھی ہمیں متعارف کرادیتی ہے، جس کے لیے میر نے کہا ہے:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

لیکن جیسا کہ ذکر ہوا کتاب میں صرف پرانے دلی والوں یا دلی کو اپنا وطن ثانی بنالینے والوں کے خاکے ہی شامل نہیں ہیں، کئی بیرونی شخصیتوں کے خاکے بھی ہیں اور ان میں دو پاکستانی بھی ہیں: جمیل جالبی اور مشفق خواجہ۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔

● جرمنی میں دس روز

مصنف: پروفیسر علی احمد فاطمی

صفحات: 92، قیمت: -/100 روپے

ناشر: ادارہ نیا سفر، 68 مرزا غالب روڈ، الٰہ آباد

مبصر: ابوظہیر ربانی، 8۔ ستلج ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی-110067

علی احمد فاطمی اردو زبان و ادب کے نقاد کی حیثیت سے تو معروف ہیں ہی، اب انھوں نے سفرنامے لکھنے کی شروعات بھی کی ہے۔ آج کل اردو میں بے شمار سفرنامے لکھے جارہے ہیں، لیکن ان میں چند ہی ایسے ملیں گے جو قاری

کی توجہ کا مرکز بن سکیں۔ علی احمد فاطمی کا تازہ سفرنامہ "جرمنی میں دس روز" اپنی سادگی اور پرکاری کے باعث اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا پہلا سفرنامہ "سفر ہے شرط" ان کے سفرلندن اور دوسرا "سات سمندر پار" ان کے کناڈا اور تاشقند کے احوال سفر پر مبنی تھا۔

اردو انجمن برلن (جرمنی) نے 1857 کی جنگ آزادی کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقع پر بہادر شاہ ظفر اور جنگ آزادی کے مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جو سیمینار منعقد کیا تھا اس میں علی احمد فاطمی بھی مدعو تھے۔ یہ سیمینار 21 جولائی 2007 کو جرمنی کے پایہ تخت برلن میں ہوا۔ علی احمد فاطمی کا جرمنی کا یہ پہلا سفر تھا۔

سفرنامہ لکھنے کی خواہش ان کے دل سے جرمنی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی پیدا ہوئی، اس کا سبب فاطمی صاحب نے تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جرمنی کا امریکا اور کنیڈا سے قدرے مختلف ہونا بتایا ہے۔ انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ کسی ملک کی تاریخ و تہذیب کو دس دنوں میں نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک شہر میں رہ کر کاروں میں گھوم لینا ہی کافی نہیں۔ تاہم برلن اور اس سے متصل شہر بوسٹڈم اور دیگر علاقوں میں کی گئی سیر و تفریح کے دوران موصوف نے جو کچھ دیکھا، اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا، اسے انھوں نے اپنے سفرنامے میں رقم کیا ہے۔ اتنے کم وقت میں کیا دیکھا جاسکتا ہے، اس کا خود انھیں بھی احساس تھا، پھر بھی سفرنامے کے جو تقاضے ہوتے ہیں، ان سے انھوں نے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ جرمنوں اور ہندوستانیوں کے عادات و اطوار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم (ہندوستانی) کافی ہاؤس میں گرجتے زیادہ ہیں اور برستے کم ہیں۔ اور یہ (جرمن) گرجتے کم ہیں برستے زیادہ ہیں۔ ہم کپڑے زیادہ پہنتے ہیں، کام کم کرتے ہیں۔ یہ کام زیادہ کرتے ہیں کپڑے کم پہنتے ہیں۔"

کسی بھی قوم کی ترقی کا راز اس کے عمل، کوشش اور محنت میں پنہاں ہوتا ہے۔ کام کم اور باتیں زیادہ کرنا کامیابی کا ضامن نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی بربادی اور تباہی کے بعد جرمن قوم نے جس تیز رفتاری سے ملک کی تعمیر نو کی ہے اس سے اس کی محنت، جانفشانی اور ایمانداری کا پتہ چلتا ہے۔ فاطمی صاحب کا مشاہدہ ہے:

"یہ قوم بے حد محنتی، سچی اور مہذب قوم ہے... ڈسپلن وے میں کام کرتی ہے.....کام کرنے کے لیے ایک دوسرے کی عزت بھی کرتے ہیں..."

فاطمی صاحب نے سفرنامے میں جرمنی کی آب و ہوا، موسم، پیڑ پودوں، سڑکوں، شہروں کی چہل پہل، مختلف پارکوں، کلب، سنیما، فلم اسٹوڈیو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں پرانی اور نئی عمارتوں، میوزیوں، پارلیمنٹ ہاؤس اور لائبریریوں وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔ ملک کی دو حصوں مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی میں تقسیم کی وجہ اور پھر منقسم جرمنی کے ہونے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

سفرنامے کے مطالعے سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ جرمنی میں بہت سے ہندوستانی ایسے ہیں جو لمبے عرصے سے وہاں رہ رہے ہیں لیکن ہندوستانی تہذیب اور اپنی زبان کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اردو تہذیب اور جرمن تہذیب میں خاصی مماثلتیں پائی جاتی ہیں اس لیے جرمن اردو کو پسند کرتے ہیں۔ ہندوستانی گیت، موسیقی اور فلم بھی ان کے درمیان مقبول ہیں۔

سفرنامے میں مصنف نے اقبال کا ذکر تو کیا ہے لیکن شہر ہائیڈل برگ نہ پہنچ پانے کے افسوس کا اظہار بھی کیا ہے، جہاں اقبال کا قیام رہا تھا۔ یہ بھی مذکور ہے کہ اس شہر میں اقبال کے نام کی کئی یادگاریں بھی ہیں۔ فاطمی صاحب نے بعض ایسے جرمن افراد سے ملاقات کا ذکر کیا ہے جن کی خوش اخلاقی اور کردار نے ان کو متاثر کیا۔ فاطمی صاحب نے اپنی عبارت کو ادبی، فلسفیانہ یا علمی مباحث سے گراں بار نہیں کیا ہے۔ سفرنامے میں دو درجن سے زیادہ تصاویر شامل ہیں، جو مختلف موقعوں پر کھینچی گئی ہیں۔ ان تصاویر میں مصنف اور ان کے دوست احباب دیکھے جاسکتے ہیں۔

● **جدید غزل**

مصنف: اشہد کریم الفت

صفحات: 128، **قیمت:** 200/- روپے

ناشر: مصنف، احمد پور، رفیع گنج، اورنگ آباد، بہار

مبصر: شعیب رضا فاطمی، مکان نمبر 1/135-36، سی. پی. جے. بلاک، نئی سیلم پور، دہلی-110053

زیرنظر کتاب "جدید غزل ایک تجزیاتی مطالعہ" میں پندرہ شعرا کی غزلوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ وہ شعرا ہیں — حسن نعیم، مظہر امام، علیم اللہ حالی، پرکاش فکری، صدیق مجیبی، سلطان اختر، فنیٰ رضوی، عین تابش، فردوس گیاوی، شاہد اختر، خورشید اکبر، عالم خورشید، سرور ساجد اور تنویر عثانی۔ فہرست کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل ناقد نے آزادی کے بعد کی نسل کا یا یوں کہیں کہ ہمعصر اردو غزل کے نمائندہ شاعروں کا انتخاب کیا ہے لیکن صرف پندرہ نام سے یہ فہرست مکمل نہیں ہوسکتی ہے، اس لیے اس کو مکمل فہرست تو بہرحال نہیں کہا جاسکتا لیکن اپنی بساط بھر جو کوشش موصوف نے کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ عہد حاضر کی شاعری کا تجزیہ ایک مشکل کام ہے لیکن اسے بڑی خوبی کے ساتھ انجام تک پہنچانے کی خوبی ہی اس کتاب کی خوبی ہے۔ عام طور پر ناقدین بعد کی نسل کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس فہرست میں ایسے کچھ شعرا شامل ہیں۔ یقیناً ایک کے بعد ایک یہ فہرست لمبی ہوگی اور نئی نسل کے شعرا کی شعری اہمیت کا اندازہ ہوگا کہ آیا انھوں نے اپنے بزرگوں سے کچھ حاصل کیا ہے یا یوں ہی ٹاک ٹوئیاں مارتے رہے ہیں۔ 128 صفحے کی اس کتاب کی قیمت 200 دیکھ کر حیرت ہوئی۔ □□□

رضوان رضوی

ایک بہادر بچہ

براعظم یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے، 'ہالینڈ'۔ وہ سطح سمندر سے اتنا نیچے واقع ہے کہ ایسے ملک کو تو پانی میں ڈوب جانا چاہیے، لیکن نہیں۔ اسے پانی سے بچانے کے لیے ہالینڈ کے باشندوں نے بڑے بڑے مضبوط پشتے کناروں پر باندھ رکھے ہیں جن سے پانی رکا رہتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک دن ایک بچہ اپنے والد کے ساتھ سیر کرنے جارہا تھا کہ اس نے پوچھا: "ابا جان! یہ بند جو چاروں طرف بنے ہوئے ہیں اگر یہ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا ہوگا؟

والد نے جواب دیا: "میرے عزیز بیٹے! اگر بدقسمتی سے ایک پشتے میں سوراخ ہوجائے اور اس کو فوراً بند نہ کیا جائے تو وہ چھوٹا سوراخ بڑا ہوکر سارے پشتے کو ختم کردے گا جس کے نتیجے میں یہ سارے مکان، کھیت، باغ باغیچے، انسان اور حیوان وغیرہ سبھی ڈوب جائیں گے۔"

یہ سن کر وہ بچہ ڈرا مگر اس کے ننھے سے دل میں یہ بات گھر کرگئی۔ اس کے کافی دنوں بعد وہ بچہ اسکول سے چھٹی کے بعد بغل میں بستہ دبائے اپنے گھر کی جانب آرہا تھا۔ شام کا وقت تھا کہ اچانک ایک آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس نے کان لگا کر سنا تو پتہ چلا کہ کسی جگہ سے پانی نکل رہا ہے۔ ادھر ادھر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ پشتے میں سے پانی کی ایک پتلی سی دھار تیزی سے نکل رہی ہے۔ اس دھار پر نظر پڑتے ہی اسے اپنے والد کی بات یاد آئی۔

اس بچے نے ہمت باندھی اور سوراخ والی جگہ پر پہنچ گیا اور جلدی سے اپنی انگلی اس سوراخ میں ڈال دی جس سے وہ دھار بند ہوگئی۔ دھار بند ہونے سے وہ بچہ مسرت سے جھوم اٹھا اور دل میں کہنے لگا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا اور انتظار کرنے لگا کہ کوئی وہاں سے گزرے تو اسے سارا ماجرا سنائے۔ اسی انتظار میں سورج غروب ہوگیا اور آہستہ آہستہ چاروں طرف تاریکی چھاگئی۔ ادھر بھوک نے بھی اسے ستانا شروع کردیا۔ سردی کا موسم، اندھیری رات، سنسان جنگل، ہوا کی سرسراہٹ اور درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے اس بچے کو جن اور بھوت نظر آنے لگے۔ لیکن جونہی اسے اپنے شہر کی بربادی کا خیال آیا تو وہ سب کچھ بھول گیا اور اپنی جگہ پر ڈٹا رہا حتیٰ کہ بچے کی مسکراہٹ کی طرح صبح ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد چند آدمی ادھر سے گزرے جو اپنے کھیتوں پر کام کرنے جارہے تھے۔ انھوں نے بچے کو دیکھ کر پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟

اس بچے نے سارا واقعہ سنایا۔ یہ حیرت انگیز واقعہ سن کر وہ سب بہت خوش ہوئے اور اس بچے کو شاباشی دی۔ جب تک وہ سب سوراخ بند کرنے کا سامان مہیا نہ کرچکے بچہ برابر اپنی انگلی سوراخ میں ڈالے ہوئے کھڑا رہا۔

دن چڑھتے ہی سارے شہر میں اس ننھے بہادر کی بے مثال دلیری کی خبر پھیل گئی جس کی ہمت سے شہر تباہی سے بچ گیا تھا۔ سارا شہر اس بچے کے ماں باپ کو مبارکباد دینے کے لیے آیا اور اب تک اس بچے کا نام بہادری کی وجہ سے زندہ ہے۔

عزیز بچو! جو لوگ قوم اور ملک کی بھی اور تعمیری خدمت کرتے ہیں وہ ہمیشہ سربلند ہوتے ہیں اور رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ رہتا ہے۔

□□□

Aashyana, Banaulia, Biharsharif, (Nalanda) 803101

قومی اردو کونسل کے ایگزیکٹیو بورڈ کی میٹنگ میں (دائیں سے) جناب اقبال مجید، محترمہ نسیم بھاٹیہ، محترمہ شبنم ہاشمی اور ڈاکٹر اطہر فاروقی۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید، مالیر کوٹلہ (پنجاب) میں قائم کیے گئے اردو تعلیمی مرکز میں نصابی کتابیں تقسیم کرتے ہوئے۔

Date of Publication : 24/10/2008
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA **Monthly, November 2008, Vol. 10, Issue: 11**
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

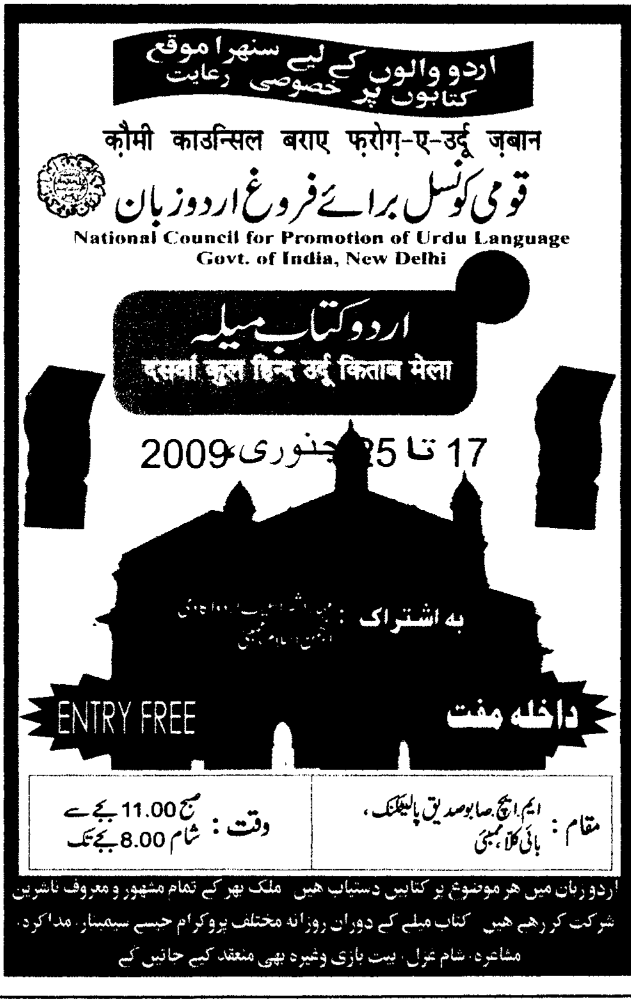

Printed and Published by Dr. AliJaved, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by Khanna Paper Mills Pvt. Ltd., Amritsar Editor: Dr. Ali Javed, Tel: 26103381, 26103938